



بسمک

مہرالنساء شاہ میر

بِسْمِ



از قلم مہر النساء شاہ میر

All Rights Reserved

Copyright: Mehrulnisa Shahmeer (Author)

Published by: Safar-e-Adab

Published On: safareadab.com

To get published with us, contact us via email or website:

safareadab.com

khanumaira@safareadab.com

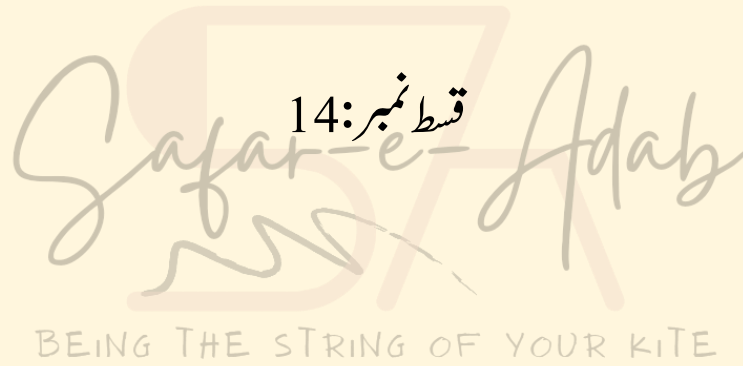
adab@safareadab.com

Note: We don't charge anything to publish online. If anyone charges any kind of fee in order to publish your write-ups in the name of Safar-e-Adab, please don't try to go ahead with them and immediately report them using the contact us button on our website. Thank you

ضروری بات

بسمل کے تمام جملہ حقوق لکھاری "مہر النساء شاہ میر" کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے پلیٹ فارم یا سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہوگی۔ بغیر اجازت کہانی کا استعمال کرنے والوں پر سخت کاروائی کی جاسکتی ہے۔ اس کہانی اور اس میں موجود کردار محض تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔





نوٹ۔

بسل کی کہانی اور مذکورہ رسم و رواج کسی بھی ذات، قوم، اور خطے کے لوگوں کی دل آزاری کے لئے نہیں لکھے گئے۔ کہانی کو کہانی سمجھ کر پڑھا جائے تو آپ کے ذہن کی سوچوں پہ وسعتیں اتریں گی۔ غیرت کے نام پہ ہونے والے قتل صرف بلوچستان نہیں پورے ملک میں ہوتے ہیں۔ اب انکی تعداد چاہے کچھ بھی ہو لیکن وہ "ہے" اور اس بات سے آپ سب اتفاق کرتے ہوں گے یہ کوئی روایت نہیں لعنت ہے۔ ہر وہ روایت جو کسی کا قتل کروائے وہ غلط ہے۔ اور اسکے لئے قلم اٹھتا رہے گا۔ مختصر یہ کہ یہ کہہ دینا کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا غلط ہے اور یہ کہنا کہ سارے ملک میں یہی ہوتا ہے یہ بھی غلط ہے۔ کہانی کسی کی دل آزاری، یا پھر جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لئے نہیں لکھی گئی۔

مہر النساء شاہ میر۔

Safar-e-Adab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”اس نے یاد کیا وہ کون ہے اور بازی پلٹ گئی۔“

وہ چاہت کی کمی کی ماری سی، سب سمجھیں اسکو دکھیا ری سی۔

کشکول اٹھا کر پھر آئی درد در، نہ ملی محبت جو نہ تھی مقدر۔

وہ لڑکی کچھ بے چاری تھی، درپیش اسکو کم توجہ کی بیماری تھی۔

لوگوں کو راضی کرتے کرتے، کھو بیٹھی اپنی عزت نفس ساری تھی۔

دن اسکے بے چین تھے، راتیں لوگوں کے لئے مختص۔

وہ جتن کر بیٹھی کئی، مگر نہ ملا اسکو کسی قربانی کا صلہ سہی۔

کیا اپنے، کیا اغیار، کیا دوست، کیا غم و خوشی کے یار۔

ہر کسی نے نوچا وقت، دیئے زخم، چھینا اعتماد، عطا کئے دوہرے معیار۔

اک روز شفاف پانیوں میں اپنا چہرے دیکھتے ہوئے، اس پہ وارد ہوئے الہام کئی۔

آنکھیں اسکی ویسی تھیں، کیسی؟ بلکل اسکے دغا باز یاروں جیسی۔

ہونٹ اسکے ویسے تھے، کیسے؟ بلکل اسکے ریاکار خاندان جیسے۔

جسم، بال، ذہانت، نقش، سب وہی تھا۔

مگر جو ایک لمحہ لے کر سوچا جائے، ذہن پہ زور ڈالا جائے۔

کیا خاص رہا ان میں، جو کرتے رہے ایک عرصہ استعمال اسے؟

نہ خدا نے انہیں بنایا آعلیٰ، نہ اسکو کسی کی خدمت والا۔

اور بیٹھے بیٹھے اسے احساس ہوا، خود شناسائی کا ایک در کھلا۔

اس نے دیئے لوگوں کو مواقع کئی، استعمال کے، مذاق کے، سوال کے، زو معنی جواب کے۔

یہ اسکی کم ہمتی تھی، مگر کیفیت یہ ساری وقتی تھی۔

اس روز اس شفاف پانی کو الوداع کہتے ہوئے، ہواؤں سے عہد کرتے ہوئے۔

اپنی ذات کی خوشیوں کا ٹھیکالیتے ہوئے، لوگوں کے دوہرے معیار کوناں کہتے ہوئے۔

اس نے کیا اپنا سر بلند، کوئی اسے استعمال کرے تو ملے گا اب بند در۔

اس نے جانا وہ ہے کون، اور پھر بازی پلٹ گئی

BEING THE STRING OF YOUR KITE

جامنی پڑتے آسمان سے سفید روئی کے گولے گر رہے تھے۔ سارے علاقے نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ پہاڑ، درخت، وادی، جنگل، گھر، بیابان، میدان عمارتیں سب سفید برف سے ڈھک گئے تھے۔ مگر انکا اصل رنگ، بھورا، ٹیالا، سبز، سرمئی کہیں کہیں سے اپنی جھلک دکھا دیتا تھا۔ لیکن وہاں اس ایک کمرے میں ہر طرف سفید رنگ تھا۔ صرف سفید۔ دیواریں بے تحاشا سفید، چھت کی سیلنگ ایک چھوٹی سی کونے میں رکھی میز سفید، مگ، پلیٹ سفید، فرش سفید، اس پہ بچھا ہوا میٹرس سفید۔

میٹرس پہ پڑا وجود کوئی ستائیس اٹھائیس برس کا نوجوان تھا۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ اسکے وجود پہ ڈھیلا ہسپتال کے لباس جیسا گاؤن تھا۔ وہ بھی سفید۔ اسکے سینے پہ کوئی پٹی بندھی تھی جسے اسکی گردن کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ اسکے میٹرس کی دائیں طرف ایک سفید پلیٹ رکھی تھی جس میں ہم رنگ غذا تھی۔ وہ کمرہ، وہ جگہ، وہ قید بے تحاشا سفید تھی۔ اس رنگ کے علاوہ وہاں کوئی اور رنگ نہیں تھا۔ میٹرس پہ لیٹے مرد کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے اور گردن پہ زخم تھے۔ گردن ایک طرف سے جلی ہوئی بھی تھی۔ وہ پہلے کی نسبت کافی کمزور لگ رہا تھا۔ وہ شاید بے ہوش تھا مگر اسکی بند آنکھوں کے پار وہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا سا منظر۔

وہ ایک سبزہ زار تھا۔ لمبے وسیع رقبے پہ پھیلا سبزہ زار۔ آسمان پہ قوس قزح تھی۔ اونچے لمبے درخت تمام تر شان سے کھڑے تھے۔ اور بند آنکھوں اور زخمی وجود والا مرد وہاں تندرست تھا۔ سبزہ زار کے اوپر آسمان معمول سے زیادہ روشن تھا۔ سبز آنکھوں والے مرد کے سامنے اس سے ذرا فاصلے پہ ایک دراز قد عورت کھڑی تھی۔ اسکے بال کمر سے نیچے تک آتے تھے۔ گہرے کاسنی رنگ کا لباس دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مرد کی طرف اسکی پشت تھی۔ دفعتاً اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسکی آنکھیں آسمان سے اترتی روشنیوں سے زیادہ روشن تھیں۔ سبز آنکھیں گھاس کے اس رنگ سے زیادہ سبز تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ پھر مرد نے اسکی اور قدم بڑھائے۔ لڑکی مسکرانے لگی۔ اسکی آنکھوں میں سرشاری کے دیئے روشن ہوئے۔ وہ بے تحاشا خوش لگتی تھی۔

شبم کے قطروں سے گیلی گھاس پہ وہ پیر دھرتے ہوئے اسکی اور بڑھ رہی تھی۔ مرد کو یوں لگا جیسے کوئی اسکے سینے پہ ٹھنڈی برف رکھ رہا ہو۔ ایک انجانا سکون اسکے رگ و پے میں سرایت کر تا جا رہا تھا۔ مگر اسی پل آسمان سے آگ کے شعلے ابلنے لگے۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ان دونوں کے درمیان زمین پھٹ

گئی، آگ کا دریا بن گیا۔ لڑکی کے لباس کو آگ نے پکڑا۔ لباس جل رہا تھا۔ سبز آنکھوں والا مرد اسکی طرف جانا چاہتا تھا مگر آگ کا وہ دریا اسکے اور لڑکی کے درمیان تھا۔ وہ اس اور بھاگا۔ آگ . . . آگ . . . آگ بس آگ ہر طرف سے ہر کہیں سے پھیلتی چلی گئی۔ سنہری آنکھوں والی لڑکی اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی مگر اوجھل ہونے سے قبل وہ پوری طرح خاکستر ہوئی تھی۔ اسکا پورا وجود بھسم ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں میں تکلیف تھی اور خواب بیکلج ٹوٹ گیا۔

میٹرس پہ پڑے وجود کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔ سبز آنکھوں کے پردے جدا ہو چکے تھے اور اسکا ہاتھ بے اختیار، بلا ارادہ اپنے دل تک آیا تھا۔ اسکے سینے کے دائیں طرف۔ سنہری آنکھیں، انکی تکلیف، وہ وجود ہاں اسے یاد تھا۔ اسے وہ سب شناسا لگا۔ وہ دوری، وہ کرب، اسکے وجود کو بھسم کرتی وہ آگ اسے سب محسوس ہوا تھا۔ وہ دل کا سکون تھی، دل سے جڑی ہوئی اور مہدی سرور کسیر پندرہ دن بعد مکمل ہوش میں آیا تھا تو اسے پہلا خیال زینیا حاکم کا آیا تھا۔

دوسرا احساس درد کا تھا جو اسکے سینے میں اٹھا تھا۔ ایسا درد اس نے آج تک محسوس نہیں کیا تھا۔ ایسی تکلیف تو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی اسے سانس نہیں آیا۔ کوئی تکلیف تھی جو اسکے سینے میں پنچے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسکی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ درد بتدریج بڑھتا جا رہا تھا اور اسکا سارا وجود جامد ہو رہا تھا۔ جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے کراہنے کی کوشش کی وہ کراہ نہیں سکا۔ درد ایسا تھا کہ وہ کروٹ تک نہیں بدل پارہ تھا اور اسی درد نے اسکے ذہن کو یکدم بیدار کیا تھا۔ ایک جھماکے سے اسکے آگے منظر کھلتا چلا گیا۔

اسکے آس پاس، دائیں بائیں ہر طرف صرف ایک رنگ تھا سفید بس موت جیسا سفید۔ مہدی کی آنکھوں میں یہ رنگ چھ رہا تھا۔ ”قیس“ اسکے لبوں سے بے حد دھیرے سے ایک لفظ

ادا ہوا۔ ”قیس . . . کدھر . . . ہو“ اسکا تنفس پھول رہا تھا آنکھیں بہہ رہی تھیں اور وہ کسے پکار رہا تھا اگر یہ اس پہ ادراک ہو جاتا تو مہدی کبیر موت قبول کر لیتا یہ پکار نہیں۔ ”قیس بھائی . . . آہ۔“ وہ کرا بنے لگا۔

معاً اس نے کوئی چاپ سنی۔ پسینے سے ترا سکے وجود کارواں رواں سماعت بن گیا تھا۔ درد کی شدت کو سہتے وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا شاید اسی کا جو اسکے ہر خوشی اور غم کا ساتھی تھا۔ سفید رنگ کے دروازے کو دھکیل کر کوئی اندر آیا۔ مہدی نے پلکیں جھپکتے ہوئے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسکے جوتے، کورے سفید، اسکے جسم پہ لمبا کافتان سفید، اسکے سر پہ بندھا کپڑا بھی سفید وہ چند لمحوں کے اندر اندر اس سفید رنگ سے بے زار ہوا تھا۔ وہ لمبا چوڑا وجود کسی مرد کا تھا۔ کرخت تاثرات، لب سیدھی لکیر میں بند، ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک میڈیکل باکس تھا۔

وہ مہدی کے قریب آ کر بیٹھا۔ درد سے دوہرے ہوتے مہدی نے کچھ پوچھنے کی، کسی سوال کی کوشش کی مگر نہیں یہ اس دنیا کا بے حد مشکل کام تھا۔ وہ اب مہدی کی آنکھوں پہ سفید پٹی باندھ رہا تھا، وہ جھپٹایا، کراہا مگر اسکی طاقت سامنے والے مرد کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے اپنے سینے پہ کسی کے ہاتھ چلتے محسوس کئے، وہاں کچھ چیچچا تھا۔ وہاں کوئی مائع تھا۔ جس کا رنگ سرخ تھا اور نوار اپنے اسیر کو اس رنگ سے آشنائی نہیں دے سکتا تھا۔

نوار نے سرخ مائع اسکے زخم پہ انڈیلا، صفائی کی۔ پٹی درست کی اور اب اس نے چند گولیاں نکال کر اسکے منہ میں رکھیں۔ چار و ناچار وہ انہیں نگل گیا۔ سینے میں درد تھا سو وہ وہیں رہا۔ ”اتنی مزاحمت کرو گے تو تم خود کو تکلیف دو گے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

میرا بھائی کہاں ہے؟ اسے بلاؤ مجھے یہ کمرہ ”بدلو انا ہے۔ بلاؤ اسے۔ یہ کونسا ہسپتال ہے؟“

وہ وجود اپنا سامان سمیٹ رہا تھا یہاں اس کمرے میں اس ڈبے سے نکلنا والا وہ واحد سامان تھا جس میں رنگ تھے۔ سفید کے علاوہ کوئی اور رنگ۔ غالباً اسکی آنکھوں پہ پٹی اسی لئے باندھی گئی تھی تاکہ وہ اس رنگ کو نہ دیکھ سکے۔ کچھ ہی پل بعد وہ مہدی کی آنکھوں سے پٹی ہٹا چکا تھا۔ اگلے کئی منٹ میں مہدی کے سینے میں اٹھتا درد تھم گیا تھا۔ وہ اب بھی عجیب نظروں سے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ اتنا سفید کیوں تھا؟

”تم فکر مت کرو میں تمہیں تکلیف میں رہنے نہیں دوں گا۔ یہ ساری تکلیف بہت جلد ختم ہوگی۔“

”تم کون ہو؟“ بہت دیر بعد اسے دروازے کی طرف جاتے دیکھ مہدی نے سوال کیا۔ ”قیس۔۔ کہاں ہے؟“ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اسکے لبوں سے ادا ہوئے۔ ”میں یہاں۔۔ کیا۔۔ کر رہا ہوں؟“ لمبے تڑنگے وجود نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”قیس کو بھیجو مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“ کونسا ہسپتال ہے؟ مجھے کیا ہوا ہے، میری بیوی کہاں ہے؟“

”تم مہدی کسیر ہو۔۔۔ میں تمہارا معالج، دوست، مسیحا۔۔۔ پندرہ دن قبل تمہیں گولیاں لگی تھیں اسکے بعد سے تم یہیں ہو۔ تمہیں کئی بار ہوش آیا لیکن آج تم مکمل ہوش میں آئے ہو۔“ اس نے پلٹ کر مہدی کو دیکھا۔ سرد تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ”کوئی۔۔ قیس۔ کسیر نہیں، کوئی زینیا حاکم نہیں۔ اب سے یہ تمہارا گھر ہے۔ میں تمہارا واحد خاندان ہوں اور میں ہی تمہاری موت۔ امید ہے ہم اچھا وقت گزاریں گے۔“

”تم کون ہو؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ کیا چاہیے تمہیں؟“ اس نے سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ چہرے پہ تعجب تھا۔

”میں زرقون کاظمی ہوں۔ تمہیں یہاں لانا سزا ہے۔ مجھے کیا چاہیے اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں اور میں یہ سب تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کیونکہ تم بہت جلد سب بھول جاؤ گے۔ اپنی آخری یادیں سنبھالنے کی کوشش ضرور کرنا مہدی سرور کمبیر۔“ اس کے انداز میں کوئی وارننگ تھی، جو مہدی کمبیر کے اندر تک اتر گئی۔

وہ کہہ کر مڑ گیا۔ مہدی جیسے سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر آس پاس دیکھا۔ سفید . . . سفید . . . سفید . . . سفید . . . سفید . . . سفید . . . اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ وہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا مگر نہیں اسے یقین نہیں آیا۔

”میرا بھائی کہاں ہے؟ قیس؟“ وہ اب بھی جسے بھائی پکار رہا تھا اسے قطعاً علم نہیں تھا وہ شخص انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں۔

”تمہارا بھائی یہاں سے کئی سو کلومیٹر دور ہے۔ اسے یاد مت کرو، بلکہ کچھ ہی وقت میں تم خود سب بھولتے چلے جاؤ گے۔“ وہ بار بار یہی کیوں دہرا رہا تھا؟

BEING THE STRING OF YOUR KITE

زرقون کی آواز پلٹ کر آرہی تھی۔ مہدی کمبیر کا دل سکڑ کر پھیلا تھا۔ خوف کے سائے ہر اور گہرے ہوئے۔ اور اس نے وہ سوال کیا جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو آنکھیں کھولتے ہی ایک لمحے کو اس کے ذہن میں آیا تھا اور اس نے جھٹک دیا تھا۔ ”یہ . . . کون . . . سی . . . جگہ . . . ہے۔“ الفاظ ٹوٹے بکھرے تھے۔ آنکھوں میں خوف تھا۔

زرقون نے اسے دیکھا۔ آنکھیں محظوظ انداز میں پھیلیں۔ ”وائٹ روم سفید دنیا میں خوش آمدید۔“

وہ کہہ کر اسکا تاثرات دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکا۔ مہدی کسیر جو کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا بری طرح زمین بوس ہوا۔ چہرے سے سارا خون کسی نے چوس لیا تھا۔ اب اسکا چہرہ سفید تھا بلکل اس قید کی طرح۔

ہسپتال کے کمرے میں بپ بپ کی آواز تھی۔ کھڑکیوں کے بلاسٹڈز سے شہر قائد کی چکاچوند کر دینے والی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ بستر پہ تکیوں کی مدد سے لیٹا وجود قیس کسیر کا تھا۔ بیڈ کی دائیں طرف وریام کھڑا تھا۔ قیس کا چہرہ زرد تھا۔ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے تھے۔ اور آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر اب قیس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور وہ اپنے ہاتھ پہ لگی ڈرپ کی سوئی پہ نظر جمائے ہوئے تھا۔

”کسیر صاحب اول تو جو آپ کے ساتھ ہوا ہے اس سے آپ کا نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا تھا۔ یا پھر آپ کا دماغ بہت بری طرح متاثر ہو سکتا تھا۔ کچھ چیزیں دماغ کے لئے سہہ جانا اور پراسیس کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ کے کیس میں آگ، کسی قریبی کی موت، یا پھر ایسی ہی کوئی صورتحال آپ کو ٹرگر کرتی ہے۔ آپ کے پچھلے ڈاکٹر نے بتایا ہے آپ لینیور سری ٹراما کے ساتھ بھی ڈیل کرتے رہے ہیں؟ اور سب سے بڑی بات موجودہ تاریخیں وہی ہیں رائٹ؟“

”علاج کیا ہے؟“ اس نے بے زاری سے ڈاکٹر کی بات کاٹی۔

”علاج زہر ہے چاہیے؟“

وریام دل ہی دل پھنکارا۔

”یہ کوئی سردرد اور بخار نہیں ہے جس کا علاج یونہی بیٹھے بیٹھے ہو جائے گا۔ یہ سیرنمیں معاملہ ہے۔ آپ کو لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر آپ کو ٹینشن سے دور رہنا ہو گا۔ آپ ان مسائل میں الجھنا بند کریں جو آپ کو جو آپ کو ٹینشن دیں۔“

”مجھے جانا ہے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسکے سارے جسم سے طاقت نچڑ کر رہ گئی تھی۔ چہرہ زرد تھا اور جسم پہ اب تک کپکپی طاری تھی۔ چھ گھنٹے بعد بھی قیس اس آگ کے چکر سے، موت کے اس کھیل سے واپس نہیں آسکا تھا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ وہ سوئی بے دردی سے نکال کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ یہ واقعی نارمل حالت نہیں تھی۔ ٹراما اور اسکے اثرات انسان کو اندر سے کھوکھلا ہی تو کرتے ہیں۔

”میں نے کچھ دوائیں لکھ دی ہیں لیکن آپ کو پورا علاج کی ضرورت ہے۔ خود سے غفلت اچھی چیز نہیں ہے۔“

قیس سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وریام اسکے پیچھے اسکے ساتھ ہی نکل آیا تھا۔ ہسپتال کے پارکنگ میں کسی گاڑی کی فلیش لائٹس قیس کی آنکھوں میں پڑنے لگیں۔ اس نے ہاتھ آنکھوں کے آگے کیا۔ کئی گھنٹوں سے کچھ نہ کھانے اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایک بار پھر اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ لڑکھڑایا۔

”دھیان سے کسیر صاحب۔“ وہ اسے سہارا دیتے ہوئے بولا۔ قیس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسکا بازو تھاما۔ لب بھینچ لئے۔ اس دنیا میں، لوگوں سے بھری اس دنیا میں وہ واحد آدمی تھا جس سے قیس مدد مانگ

سکتا تھا وہ اسکا بھائی تھا۔ اور وہ اب نہیں تھا۔ جانے کیوں اسکی کمی ہر جگہ محسوس ہو رہی تھی، جانے کیوں؟ وہ تھام لیتا تھا جو گرنے کا خوف ختم ہو جاتا تھا اور اب وہی خوف ہر طرف تھا۔

کچھ دیر بعد گاڑی تک آتے ہوئے وہ دوبارہ بظاہر نارمل ہو گیا تھا۔ کوٹ بازو پہ ڈالے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اسکے چہرے پہ انتشار تھا۔ اسکی سفید شرٹ کے بازو پہ زینیا کے بازو کا خون اب تک تازہ تھا۔ ”اسے کہاں بھیجا ہے تم نے؟“

”میں نے؟“ وریام نے بے یقینی سے سینے پہ انگلی رکھی۔ ”میں نے کہاں بھیجا؟ آپ کے سامنے وہ بھاگ گئی۔ پولیس کی گاڑیوں کو آگ لگی ہے۔ ڈپارٹمنٹ کا نقصان الگ ہوا ہے۔ اگر آپ بیچ میں نہیں آتے تو یہ سب نہیں ہوتا۔ آپ نے پولیس کو اپنا کام کرنے نہیں دیا۔ آپ پہ کیس بن سکتا ہے۔“

”میں hallucinate نہیں کرتا مسٹر وریام میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا سب۔ یہ بیماری میرے اندر ہے میرے اوپر سوار نہیں۔ اس لئے مجھے صاف صاف بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”غیرت کے نام پہ ایک اور قتل۔“ گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے عام انداز میں اطلاع دی۔ ”اسکے بھائی اور کزن نے مل کر اسے قتل کر دیا ہے اور لاش سمندر میں بہا دی۔ وہ لوگ اس بات کو ماننے ہتیار نہیں لیکن جلد مان لیں گے۔“

”اور تم چاہتے ہو میں اس بات پہ یقین کر لوں؟“ اسکا گلابیٹھا ہوا تھا۔

”میرا کام آپ کو یقین دلانا نہیں ہے۔ میں وہ بتا رہا ہوں جو ہوا تھا اور ڈاکٹر نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ آپ اپنی طرف سے چیزیں سوچ سکتے ہیں۔“

”مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارا کیریر کھا جاؤں۔ وہ کہاں ہے بس اس ایک سوال کا جواب دو مجھے۔“ اسکا دماغ اب تک پوری طرح بیدار نہیں تھا۔ سڑک پہ چلتی گاڑیاں، روشنیاں، ہر شے اسے عجیب کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اسے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

”میری طرف سے آپ کو اجازت ہے جو کرنا ہے کر لیں۔ (نو کری ویسے خطرے میں ہے چھو کری ہے نہیں کیا لے لے گا یہ؟)“ گاڑی اب اسی پرانے محلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مگر اب سب کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ پولیس کی وہ بھاری نفری۔ بندوقیں نیچے کئے گئے ہانک رہی تھی۔ اسپیکر پکڑے کھڑے افسر کے چہرے پہ بے زاری تھی۔ گلی کے دونوں اطراف لوگ، پولیس، گاڑیاں تھیں اور درمیان میں وہ چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اسکے ذہن میں کوئی الارم سانج رہا تھا۔ کچھ ہو گیا تھا کچھ جو بے حد برا تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے عین سامنے دیکھا۔ پولیس کے دو افسر گھر کے اندر سے دو مردوں کو گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے۔ انکے سینے، بازو، اور قمیض کے دامن پہ خون لگا تھا۔ قیس کے دل کو دھکا لگا۔ اسکی آنکھیں ایک نقطے پہ ساکن ہو گئیں۔

ایسی بھی کیا غیرت؟ بچی کو قتل ہی کر دیا۔“ پاس کھڑے کسی مرد نے تبصرہ کیا۔ قیس کا دل مٹھی میں جکڑا گیا۔

”آج کل کی لڑکیوں میں بھی تو حیا نہیں رہی ناں کمبخت۔“

وہ دل پکڑ کر بیٹھ جانا چاہتا تھا اسے آگے نہیں بڑھنا تھا۔ مگر بغیر کسی کی طرف دیکھے وہ اندر کی اور بڑھا۔ صحن میں کئی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ صف ماتم بچھا ہوا تھا۔ وہ اس ایک صدی میں دوسری موت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسکے قدم اٹھنے سے انکاری ہوئے۔ اس نے امینہ بیگم کو اپنی طرف آتے

دیکھا۔ وہ اسکے گریبان جھنجھوڑ رہی تھیں۔ قیس کچھ سمجھ نہیں پایا۔ انہوں نے اسکے چہرے پہ تھپڑ دے مارا وہ رد عمل نہیں دے سکا۔ وہ بس صحن کے بیچوں بیچ رکھے اس جنازے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اگر یہ ”وہ“ ہوئی تو وہ مر جائے گا۔ دھیرے سے انکے ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹاتے ہوئے وہ اس طرف بڑھا جہاں وہ لوگ تھے۔ ہر ایک قدم پہ اسکا دل جھکڑ میں مبتلا ہوتا جاتا تھا۔ وہ تخت کے قریب آ کر رکا۔ کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر اس چہرے سے ہٹائی۔ اور وہ تھم گیا۔ وہ زینیا نہیں تھیں۔ یہ عورت اسکی ماں کی ماں تھی۔ اسکا چہرہ سفید تھا۔ آنکھیں بند۔ وہ اس جہاں سے نہیں رہی تھی۔

ملال تھا کہ کیا قیس کی آنکھیں ہلکی سی نم ہوں۔ یہ وہ عورت نہیں تھی خوشی تھی کہ کیا اسکے دل میں تقویت بھی اتری، مگر ملال ہر دوسرے جذبے پہ بھاری تھا۔ اس نے جھک کر اس برف ہو چکی عورت کے ماتھے کو ہلکا سا چھوا۔ ”دنیا قید تھی۔ آزادی مبارک،“ انکے کان کے پاس کہتے وہ سیدھا ہوا۔

پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ کسی نے قیس کلبیر کو پھر مڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لمحے کے اندر اندر وہ جہنم دیکھ آیا تھا۔ وہ کیسے مڑتا؟ باہر جاتے ہوئے اسے اندازہ ہو چکا تھا زینیا حاکم سے دوری کا خیال بھی اسکے دل کو مردہ کر سکتا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR LIFE

زینیا حاکم کی کہانی وقت کے حساب سے باقی (کرداروں سے آگے رہے گی)۔

موجودہ دن۔

ڈھاکہ کی ہوائیں پر نم تھیں۔ سمندر کی لہریں اور بھانت بھانت کی بولیاں سنتے ہوئے اور سب سے بڑھ کر ایک غیر قوم کے درمیان ہوتے ہوئے وہ اب تک شل تھی۔ اسکے ساتھ آنے والا آدمی عبدل وحید تھا۔ ڈھاکہ پورٹ پہ کھڑے ہوئے اس نے زینیا کا تعارف کیا کروایا تھا اسے یاد نہیں کرنا پڑا۔

”یہ میری بھتیجی ہے زوہرا متین۔ بول نہیں سکتی بیچاری۔“ اسکا پاسپورٹ بھی تھا جس پہ اسکی تصویر تھی، اسکا نام بدلا گیا تھا، ولدیت کے خانے میں حاکم نہیں تھا۔ کسی نے اسکے دل پہ آری سے وار کر دیا تھا۔ وہ گھائل ہی تو ہوئی تھی۔ ساری دنیا الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

وہ ایک غیر ملک میں تھی۔ وحید اپنے تعلقات استعمال کر رہا تھا وہ الیگل تھی۔ وہ جو بلانے پہ لوگوں کے گھر نہیں جایا کرتی تھی وہ کسی چور کی طرح کسی کی زمین میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ اس سمندر میں غرق ہو جانا چاہتی تھی۔ لوگ اپنا اپنا کام کرتے نظر آرہے تھے مگر زینیا کو لگا ہر کوئی اسے دیکھ اور اس پہ ہنس رہا تھا۔ وہ ایک چور تھی۔ لوگ اسکو عزت کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

(”وحید . . . یہ پاسپورٹ جعلی ہے۔ تم اسکے ذریعے اس بچی کو آگے کیسے لے کر جاؤ گے؟“ کسٹم افسر دبی دبی آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ زینیا سنتی رہی۔ بس سنتی رہی۔ یہ زبان اسکے لئے انجان تھی۔ مگر عمل ہر انسان سمجھ لیتا ہے۔

”میں رقم بڑھا دیتا ہوں۔ تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے امریکا یا لندن لے آیا ہوں۔ اب آگے کا معاملہ تم سنبھالو گے بس یہاں سے نکلنے کی ہی بات ہے۔ اسکے بعد کونسا بنگلہ دلش اور کونسا پاکستان۔“

افسرو حید کا شناسا تھا۔ وہ اسے کوئی تسلی دے رہا تھا۔ آگے کیا معاملات ہوئے کیسے ہوئے اسے علم نہیں تھا۔ اسے بس یہ معلوم تھا وہ زوہرا نہیں زینیا ہے۔ اسے یہ معلوم تھا وہ بول سکتی ہے گونگی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا یہ اسکی جگہ نہیں ہے۔)

وقت اسکے ساتھ یہ مذاق کرے گا اس نے کہاں سوچا تھا؟ اسکا بھائی اسکا ادا اسے اس طرح کسی کے حوالے کیسے کر سکتا تھا؟ یہ وہ سوچیں تھیں جو اس ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اسے آئیں تھیں۔ وہ چپ چاپ سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسکے ساتھ بیٹھا وحید مختلف کالز کر رہا تھا۔ وہ بے حد مصروف آدمی تھا۔ یہ وہاں بیٹھے اسے اندازہ ہوا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ ایک غیر ضروری اضافہ تھی یہ ادراک بھی اسے ہو چکا تھا۔

یہ شہر بے حد مصروف اور پر شور تھا۔ سڑکوں پہ لگے بل بورڈز پوسٹر پہ لکھی لائنز اسکے لئے سب غیر شناسا تھا۔

منظر کسی بیٹھک کا تھا شاید۔ صوفوں پہ دو مرد آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وحید اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ درمیانی سائز کے ون سیٹر صوفہ پہ بیٹھی زینیا اسکی بات سنتی رہی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”صرف تمہارے بھروسے بچی کو یہاں لایا ہوں میں۔ پوری امید ہے تم اسکے سارے معاملات کا ویسے خیال رکھو گے جیسے میں چاہتا ہوں۔“

”آج تک آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا وحید بھائی۔ خلیل احمد تم پہ، اور تمہارے کہے کام کے لئے حاضر ہے۔“ خلیل احمد کے بڑے تعلقات تھے۔ اور غالباً وہ انہی کے استعمال کی بات کر رہا تھا۔

”بچی نے پہلے ہی بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں تم سے امید رکھوں گا کہ وہ مزید کچھ نہ دیکھے۔“ چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے وحید نے اضافہ کیا۔

خلیل نے اسکی بات پہ ایک بار پھر یقین دہانی کروائی۔ اس بیٹھک سے نکلنے کے بعد سفر ایک بار پھر شروع ہوا تھا۔

ڈھاکہ جدید بھی ہے اور پسماندہ بھی۔ کہانی کا مرکز اس وقت جدید ڈھاکہ ہے۔ جہاں اونچی اونچی رہائشی عمارتیں ہیں۔ لوگوں کا جم غفیر ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا ڈھیر سارا استعمال ہے۔ یونیورسٹیز اور کالجز کی بہتات ہے۔ پبلی ٹیکسی نے ایک بار پھر اپنا سفر جہاں روکا وہ ایک تین منزلہ اونچی عمارت تھی۔ عبائے میں ملبوس لڑکی نے گاڑی کی کھڑکی سے گردن پھیر کر دیکھا۔ اسکے دل کو ایک بار پھر انجانے خدشات نے آن گھیرا۔ وحید گاڑی کی دوسری طرف سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ پھر اس نے زینیا کی طرف سے آکر دروازہ کھولا۔ وہ تامل کا شکار رہی۔ مگر وہ اندر بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی سو باہر نکل آئی۔

وہ ایک چھوٹی سی ہاؤسنگ سوسائٹی تھی جس کے چاروں اور چھوٹی سی دیوار تھی۔ اندر تین سے چار منزلہ مکان تھے۔ جن کی تعداد گیارہ کے قریب تھی۔ گھروں کے آگے بڑا سمیدان تھا۔ جہاں بچے کرکٹ کھیلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

گیٹ عبور کر کے روش کو پیروں تلے روندتے، چند منٹ کا ٹھہراؤ رکھتے تیسرے نمبر پہ تین منزلہ مکان کی طرف آؤ تو وحید ایک گھر کی بیل بجا رہا تھا۔ زینیا چپ چاپ اسکے عقب میں کھڑی تھی۔ اسکی کیفیت یوں تھی جیسے کوئی مومی مجسمہ جسے جہاں چاہو موڑ دو، مروڑ دو۔ کئی لمحے بعد دروازہ کھلا۔ دروازے کے عین بچوں بچ ایک عورت ایستادہ تھی۔

اگر مجھے دو منٹ دیر ہو جاتی تو کیا تمہاری یہاں موت واقعی ہو جانی تھی؟“ وہ شفاف بنگالی میں گرج کر بولی۔ زینیا سہم کر پیچھے ہٹی۔ ”اب یہ کیا ڈرامے بازی کر رہی ہے۔ اس نے کبھی چیختی ہوئی عورت نہیں دیکھی؟“ عورت ایک بار پھر ناگواری سے بولی۔

”دیکھی ہوگی مگر غراتی ہوئی ڈائن دیکھنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔“ وحید نے اس کے علم میں اضافہ کیا، اور زینیا کو لئے اندر آیا۔ وہ دونوں پہلی دو منزلیں چھوڑ اس عورت کی معیت میں تیسری منزل کی طرف چل رہے تھے۔ گھر کافی بڑا اور اچھے سے فرنشڈ تھا۔ صفائی ستھرائی اور سلیقے نے اسے مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ وحید نے اسے ایک کمرے میں بٹھایا۔ اور خود باہر چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک بے حس و حرکت وہیں بیٹھی رہی۔ خاموش، چپ چاپ۔ کم از کم اس ایک صدی میں اسکا دماغ یہ سب پراسیس نہیں کر سکتا تھا۔ اگلے کئی لمحے وہ بیڈ پہ یونہی سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ باہر سے وحید اور اس عورت کے بولنے کی آوازوں کے ساتھ اب ایک مرد کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

”جو ان لڑکی ہے بھائی صاحب میں اسکی ذمہ داری کیسے لے سکتا ہوں؟“ لاؤنج سے ایک متفکر آواز آئی۔

”وہ بہت ٹیلنٹڈ ہے۔ وقت برابر رہا ہے لیکن اسکا کردار اور اسکی ذہانت عظیم ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں

یونہی اٹھا کر کسی کو بھی تمہارے گھر لے آؤں گا؟ اس ملک میں صرف دو لوگوں پہ اعتبار کرتا ہوں میں۔“ وحید سنجیدگی سے بولتے ہوئے ایک پل کو رکا۔ ”ایک تم اور ایک رفیق۔ ماضی میں تمہارے کئی کام کئے مگر میں نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں فلاں وجوہات کی بنا پہ میں یہ کام کر نہیں سکتا۔“

”میں آپ کو منع نہیں کر رہا وحید۔ لیکن آپ میری بات سنیں۔“ اب کے رفیق کہہ رہا تھا۔ ”لڑکی ذات اول تو ذمہ داری ہے۔ دوسرا میری بیوی آج یا کل میکے سے آجائے گی اور تیسرا میں اس لڑکی کو یہاں کیا کہہ کر رکھوں؟“

”مہمان . . . کیونکہ وہ وہی ہے۔ چھ ماہ اسے یہاں رکھو اور اسکے بعد وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ جو اسکے ساتھ ہوا ہے اس سے نکلنے کے لئے اسے چھ ماہ چاہیے۔“

”میں . . رفیق نے کچھ کہنا چاہتا مگر نیا اسے ٹوک گئی تھی۔

”میں اسے رکھنے کے لئے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“ نیا کی آواز کھر دری تھی۔ کانوں کو چھنے والی۔ ”ان چھ ماہ کے بعد بھی وہ اپنے ملک نہیں جاسکتی لیکن چھ ماہ کے بعد میں اسے اپنے ساتھ بھی نہیں رکھنے والی۔ اور اس عرصے میں یہ لڑکی ہر وہ کام کرے گی جو میں چاہوں گی۔ نخرہ کیا تو گھر سے باہر، ڈرامے بازی کی تو ملک سے باہر۔ اب اپنا اپنا سوچ لو۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔ زینیا نے دروازے کی دراڑ سے جھانک کر دیکھا۔ نیا نامی عورت چالیس کا ہندسہ پار کر چکی تھی۔ اسکی رنگت پکی سانولی تھی۔ جسم بھاری بھر کم اور بال لمبے جنہیں اس نے چٹیا میں گوندھ رکھا تھا۔

رفیق بڑی بہن کے سامنے چپ رہا مگر اندر سے وہ اب بھی اضطراب کا شکار تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ مجھے یقین ہے چھ ماہ بعد وہ ایک مختلف انسان ہوگی۔“ وہ باخوشی رضامند ہو گیا تھا۔ اندرائی باتیں سنتی ہوئی زینیا ہر اس احساس سے عاری تھی جو اسے تکلیف دیتا، خوش کرتا، اداس کرتا، یا پھر پریشان کرتا۔ اس نے دھیرے سے گردن کو ڈھکتا اسکارف ہٹا کر سفید ہنس والا پینڈنٹ اپنی آنکھوں کے آگے کیا۔ وہ یاد آیا، اسکا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے آگے گھوم گیا۔ پھر نگاہیں پھر دھندلی پڑنے

لگیں۔ وقت پھر سست ہو گیا اور دل . . . دل کو کسی نے چیر کر دو حصے کیا۔ مہدی کمبیر کے بغیر اگر کوئی زندگی تھی تو اس سے لے لی جائے۔

ماں تھرا باز یاد کھنا غاں۔ (میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں)

پینڈنٹ لبوں سے لگائے اس نے کسی کو بتایا۔ وہ نہیں رہا تھا تو اسکی یادیں زندگی کا قیمتی حصہ بن گئی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے اور وہ چپ چاپ اس بستر پہ لیٹ گئی۔ قسمت اور وقت اسکے ساتھ مزید کیا کیا کر سکتے تھے وہ آخری حد دیکھنا چاہتی تھی۔

سفید کمرے میں موت جیسی خاموشی تھی۔ میٹرس پہ پڑے ہوئے وہ کافی دیر سے دیواروں کو گھور رہا تھا۔ مہدی کمبیر کے لئے یہ لمحات سست تھے یا پھر تیز رفتار اسے علم نہیں ہو سکا۔ زر قون کے جانے کے بعد اس پہ نیند کا غلبہ طاری ہو چکا تھا۔ جب اسکی آنکھ دوبارہ کھلی تب اسے احساس ہوا کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ غلط تھا، دو دن بیت چکے تھے۔ وہ ہوش اور مدہوشی میں مبتلا رہا تھا۔

کہنی پہ زور دیتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ بے حد مشکل سے، ہانپتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ خاموشی اور اکیلے پن سے اکتاتے ہوئے اس نے بس یہاں سے باہر نکلنے کی خواہش کی تھی۔

اس سفید کمرے کے پار، اسکی آنکھوں کے پردے کے پیچھے ہر منظر رنگین تھا۔ وہ بالکنی میں کھڑا تھا، زینیا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اسکی باتیں دل پہ نقش کر رہی تھی۔ پھر شور اٹھا، وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے

ہٹنے کو کہہ رہی تھی مہدی اسکا اشارہ نہیں سمجھ سکا۔ اور پھر اسکے سینے میں کچھ کھب گیا تھا۔ اسکے بعد کیا ہوا تھا؟ اسے کیوں کچھ یاد نہیں آرہا تھا؟ بے زاری حد سے سوا ہونے لگی تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور ایک بار پھر وہ سفید دیواریں، سفید سیلنگ، سفید فرش۔ مہدی کا دماغ اب باقاعدہ چکرارہا تھا۔ اسے فرسٹریشن ہونے لگی۔

”کوئی ہے؟..... مجھے بات کرنی ہے.... کوئی ہے؟“ اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اسکے دل و دماغ میں وحشت گھر کر رہی تھی۔ ”زرقون.....“ قید خانے سے آوازیں پلٹ پلٹ کر واپس آنے لگیں۔ ”کوئی ہے؟ کوئی مجھ سے بات کرو.... تم کون ہو... مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر سینے میں ایسا درد اٹھا تھا کہ الامان وہ دوبارہ گر پڑا۔ درد شدید ہونے لگا۔ شاید اسکے زخم صحیح نہیں ہو سکے تھے۔

”پلیز مجھے یہاں سے باہر نکالو... تم جو کوئی بھی ہو میں تمہیں پیسے دے سکتا ہوں۔..... میرا بھائی تمہیں پیسے دے گا۔ مجھے..... مجھے یہاں سے پلیز نکالو۔“ آوازیں پلٹ پلٹ کر واپس آرہی تھیں۔ قید خانے میں خاموشی کا راج رہا۔ ایسے جیسے وہاں اسکے علاوہ کوئی بستا ہی نہ ہو۔

”تم جو بھی ہو.... جو بھی چاہتے ہو میرے سامنے کیوں نہیں آتے؟“ وہ حلق کے بل چیخا۔ ”مجھے یہاں سے نکالو... تم کون ہو؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ یہ کیسی جگہ ہے میرے دماغ کو کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارا باس کون ہے۔ کتنے پیسے چاہیے تمہیں۔ میرے پاس بہت پیسہ ہے تم رقم بتاؤ۔؟“ کوئی جواب نہ آیا تو وہ تھک کر سیدھا لیٹ گیا کہ اب مزید چلانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اسکے سینے میں ہر پکار کے ساتھ درد اٹھ رہا تھا۔ اسے خوف آرہا تھا۔ ہر شے سے اور موت سے۔

کتنے منٹ گزرے، کتنے لمحے بیتے اسے اندازہ نہیں ہوا مگر اس نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی جب دروازے کے پٹ آپس میں جدا ہوئے اور زر قون ہاتھ میں ٹرے لئے اندر آیا۔ ”آرام سے آرام سے، اٹھنے کی کوشش مت کرنا تمہارے زخم ابھی ہرے ہیں۔“ اس نے سفید رنگ کی ٹرے میٹرس کے قریب رکھی۔ سفید سادہ چاول۔ ہم رنگ گلاس میں دودھ۔ مہدی پاگل ہونے لگا۔ اسے اس رنگ سے جیسے وحشت ہو رہی ہو۔ وہ اپنے بال نوچنے کے قریب تھا۔

”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ تم جو چاہتے ہو جو کہو گے میں وہ سب کر دوں گا۔ بس پلیز مجھے یہاں سے نکالو۔“

”کھانا کھاؤ پھر بات کرتے ہیں۔“ وہ اسے بچوں کی طرح پچکارنے لگا۔

”مجھے نہیں کھانا مجھے بس یہاں سے نکالو تم جو چاہو گے میں تمہیں وہ سب دے دوں گا۔“

”اگر تم کھانا کھاؤ گے تو کوئی بات ہوگی ورنہ میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

مہدی نے ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ ”اوکے۔“ ایک لفظی رضامندی دے دی۔ زر قون مسکرایا۔ پھر چاولوں کا چمچ بھر کر اسکے منہ کے قریب لے گیا کہ مہدی اپنے ہاتھ کو اتنا اونچا نہیں لے کر جا سکتا تھا۔

”گھر جا کر کیا کرو گے؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھنے لگا۔

”میرا گھر ہے۔ میرا خاندان ہے بیوی ہے۔ ان سب کو میری واپسی کا انتظار ہو گا۔“ وہ قدرے چڑ کر بولا۔

”ایسا تو بالکل نہیں ہے۔ تم غلط سوچ رہے ہو۔ اس نے دودھ کا گلاس اسکے لبوں سے لگایا۔

”میں چاہے کچھ بھی سوچ رہا ہوں تم آخر مجھے میرے گھر کیوں نہیں جانے دے رہے۔ یہ کیسی جگہ ہے میں یہاں کیوں ہوں؟“

”تم بہت بے صبر ہو۔ چیزیں اور بھید وقت لیتے ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر دودھ کا گلاس مہدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جسے اس نے جھٹک دیا۔ گلاس نیچے گر گیا۔

”میں تمہیں کچھ بتانے آیا تھا۔ لیکن تم نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے، اب تم تھوڑی دیر مزید انتظار کرو۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہدی کا دل حلق میں آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر نہیں اٹھ سکا۔ کوئی سینہ چیرنے والوں سے کہے یہ زخم سل بھی جائیں تو نشان اور درد باقی رہ جاتا۔

”تم ایسے نہیں جاسکتے تمہیں مجھے بتانا ہو گا کیا ہوا ہے۔“ وہ اسے جاتے دیکھ ہدیائی انداز میں چیخا۔ ”میری بیوی کیسی ہے؟ کہاں ہے وہ بتاؤ مجھے؟“

زرقون اس کمرے سے نکل آیا۔ باہر وسیع رقبے پہ پھیلا، شاہانہ دربار سا تھا۔ قطار در قطار کمرے تھے اور صد شکر وہاں رنگ تھے۔ سفیدی دم توڑ گئی تھی۔ وہاں کئی در کر زنا رنجی رنگ کی وردی پہنے کئی کارٹنز اٹھائے یہاں سے وہاں کام کرتے نظر آرہے تھے۔ لفٹس کی بپ بپ کی آوازیں کارڈز کے سوائپ کرنے کی صدا میں، اور ایک سوال افسر کی ہدایت اسپیکر میں گونج رہی تھیں۔ یہاں زندگی بے حد مصروف تھی۔

زرقون نے بے زاری سے اپنا سفید کافٹان وہیں کہیں گر ادیا۔ یہاں سے وہاں، آگے پیچھے لوگ تھے۔ کوئی صفائی کرتا نظر آرہا تھا تو کسی کے ہاتھ میں کپڑے کے رولز تھے۔ نگاہیں گھما کر دیکھو تو وہ عمارت ایک ویئر ہاؤس تھا۔ قیسم اور بیز کلکیشن کا ویئر ہاؤس۔ اسلام سے کچھ فاصلے پہ مری کے قریب ایک خالی اور سنسان جگہ پہ واقع اس ویئر ہاؤس میں کپڑا اسٹور کیا جاتا تھا۔ یہاں آنے والا زیادہ تر کپڑا قیسم ٹیکسٹائل سے آتا تھا جو

کہ فیصل آباد میں واقع تھی۔ ویڑھاؤس کے اندر ہی ایک بڑے سے کمرے کو مہدی کمبیر کے زندان بنادیا گیا تھا۔ زر قون کاظمی آس پاس نگاہ دوڑاتے اپنی تسلی کرتے چلتے ہوئے ویڑھاؤس کے دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

مری میں اس وقت برف باری عروج پہ تھی۔ موسم بخ تھا۔ یہاں سے دور زندگی بھاگ رہی تھی مگر یہ علاقہ قدرے ویران تھا۔ اس نے واکی ٹاکی کان سے لگایا۔ دوسری طرف کال جانے لگی۔ وہ بوٹ سے فرش مسل رہا تھا۔ رابطہ ملنے کا یہ انتظار اس نے بے حد صبر کے ساتھ کیا تھا اور بلاآخر رابطہ مل گیا تھا۔ جہاں رابطہ ملا تھا وہ شخص اسلام آباد کے ایک پوش علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کا اٹھنا بیٹھنا امراء میں تھا اور روساء اسکے قدموں میں اپنی قسمت دیکھنے بیٹھتے تھے۔ جس کے پاس دولت کے ڈھیر تھے اور وہ جس کے ستارے آج کل عروج پہ جانے کے خواہشمند نظر آرہے تھے۔ اس آدمی نے بہت کچھ کھویا تھا مگر جو پانے کی تگ و دو وہ کر رہا تھا وہ ”دنیا“ تھی۔ اسکے گھر کی گلاس وال کے باہر شہر خاموشاں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ زندگی سے بھرپور روشن عمارتیں۔

”باس“ زر قون نے دوسری طرف اسکی موجودگی چیک کرنی چاہی۔ وہ اسکا باس نہیں تھا خیر۔

”بولو زر قون۔ کیسا ہے میرا دوست؟“ گلاس میں پڑے مشروب کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ایک ہی سوال کے ساتھ جاگا ہے، اور اسی ایک سوال کے ساتھ مرے گا یہ میرا اندازہ ہے۔“ زر قون اکتایا۔

”میں تمہیں لاکھوں روپے اندازے لگانے کے لئے دیتا ہوں۔“

اس نے تین سے چار گھونٹ لئے۔ زر قون نے ماتھے کو مسلا۔ بے زاری سے گردن گھمائی۔ ”یہ سفید چولا پہن کر گھومنا ایک انتہائی بورنگ کام ہے۔ آپ کو اس کے لئے میں ہی ملا تھا؟“

”کیونکہ اس سفید کو سیاہ تم ہی کر سکتے تھے۔ کوئی بات نہیں اگر کام پسند نہیں آ رہا تو واپس آ جاؤ۔ باقی کی رقم بھول جاؤ کیسا؟“

”بس یہیں آ کر میری غیرت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ پیسہ نہیں چھوڑ سکتا باس۔“

”میں نے بھی تمہاری غیرت کے پیمانے ناپ کر تمہیں یہ کام سونپا تھا۔ کہو پھر کیسا ہے میرا دوست؟“

”زخم گہرے اور ہرے ہیں۔ طبیعت کے ساتھ ساتھ اسکا دماغ بھی ناساز ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری ملاقات دو بار ہوئی ہے اور دونوں بار میرے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچا ہے۔ بولتا بہت ہے۔“ آخری بات شکایت تھی۔ برف کی طرف پیٹھ کئے اب وہ آس پاس گزرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے باس کی گفتگو سے لاعلم تھے وہ لاعلم تھے کہ یہاں جو کوئی انسان قید ہے اور کو قید ہے وہ مہدی کبیر ہے۔

ان دونوں مردوں کو سکریں کے چوکھٹے پہ تقسیم کرو تو ایک آدمی گلاس وال سے شہر دیکھ رہا تھا اور دوسرا اسکی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھا۔ دو مختلف لوگ مگر انکا مقصد ایک ہی۔

”اسے بتاؤ اسکی بیوی کہاں ہے۔ اسکے بھائی نے اسکے ساتھ کیا کیا ہے۔ اسکی بیوی نے کتنے مردوں کے درمیان کتنا وقت گزارا ہے اور اسے بتاؤ اسکے اپنے بھائی نے کس طرح اسکا سینہ چھلانی کیا ہے۔“ مشروب لبوں سے لگاتے ہوئے ”براق حنیف“ نے مدھم مسکراہٹ سے کہا۔ کئی بار ہم جسے اپنی کہانی کا ولن سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ اصل میں بس ایک پیادہ ہوتا ہے۔ قیس کبیر، اکتیس دسمبر کی رات ایک پیادہ تھا۔ بادشاہت اس روز براق حنیف کے ہاتھ تھی۔ پیادہ مگر حکم کا غلام نہ تھا۔ وقت، حالات اور واقعات کو

ایک بادشاہ کی طرح اپنے حق میں تبدیل کیا تھا۔ براق چہرے پہ کئی ملمع چڑھا کر بھی منافق بن سکتا تھا، دوغلا بھی، پیٹھ پیچھے وار کرنے والا بھی۔ مگر اسکا باپ اسکے بارے میں بے حد درست تھا یہ آدمی بادشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ شاید یہ اسکا بخت نہیں تھا۔

”ابھی سے سب بتا دوں؟ لیکن اسے مار چر کرنے کا مزہ ہی ابھی شروع ہوا تھا۔“ اس نے دروازے کی ٹیک چھوڑی وہ بری طرح بد مزہ ہوا تھا۔

”ایک سیاح اور ایکسٹر وورٹ آدمی ایک سفید کمرے میں بند ہے۔ رنگ اور لوگوں سے دور۔ فکر مت کرو۔ تمہیں بے حد مزہ آنے والا ہے۔ اسے بتاؤ اور مجھے اپ ڈیٹ کرو۔“

”راجر باس۔“ زر قون کے چہرے سے کلفت غائب ہوئی۔ ”ویسے ایک بات بتائیں، مارنا تھا ناں؟ مار دیتے۔ زندہ کیوں رکھا؟“

دوسری طرف براق کے چہرے پہ یکدم کچھ در آیا تھا۔ آنکھیں حزن میں ڈوبیں، دل میں غم کے سائے گہرے ہوئے۔ وہ اگلے کئی لمحے بے حد خاموش رہا۔ پھر اسکی مدھم آواز سنائی دی۔ ”موت بے حد آسان ہے زر قون کاظمی۔ مشکل تو زندگی ہے۔ وہ زندگی جس سے رنگ رخصت ہو جائیں۔“

”محبت کے رنگ؟“ زر قون نے لقمہ دیا۔ براق کی آنکھوں کے آگے سیاہ آنکھیں آئیں۔ اس نے سر جھٹکا، دل کو ڈپٹا۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔

”مجھے جلد اپ ڈیٹ کرنا۔“ متوازن انداز میں کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم لیتا وہ سلائیڈنگ ڈور پار کرتے ہوئے پول کی طرف آیا۔ پانی میں کوئی عکس بننے لگا تھا۔ عکس پھر منظر بنا اور منظر

میں براق حنیف کے وجود نے غوطے مارے، اور جب سر اٹھایا، آس پاس دیکھا تو بہت کچھ تھا جو اس کا اور تمہارا منتظر تھا جاننا چاہتے ہو کیا؟

اکتیس دسمبر کی رات سے کچھ دن قبل۔

”انسان کہانی کو ترتیب دیتا ہے مگر، ٹونسٹس کے لئے خود کو تیار نہیں کر پاتا۔“

”تم میری ایک بات سمجھ جاؤ حبیب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“ انٹرکام اٹھاتے ہوئے اس نے بے زاری سے دہرایا۔ دوسری طرف کنیکٹڈ کال پہ حدیبیہ نے گہری سانس لی۔

”میری مدد اب میں بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں ”انہیں“ چھوڑ نہیں سکتی۔“

”یہ تم دونوں کا معاملہ ہے تم مجھے کیوں بچ میں لارہی ہو۔“ اسکیچ پہ پنسل پھیرتے وہ اکتاہٹ سے بولا۔ آرٹسٹ اپنے کام میں مداخلت برداشت نہیں کر پار ہا تھا۔

”پھر آپ کا معاملہ زیر بحث لے آتے ہیں۔ قیس کمبیر کے قتل کی سازش کر رہے ہیں ناں آپ؟“ وہ بڑے آرام سے اسکے سر پہ دھماکہ کر گئی۔ براق کے ہاتھ سے پنسل چھوٹ کر گری۔ اس نے تیزی سے کال کاٹی اور دروازہ کھول کر تیز تیز قدموں سے شا کرہ کے کین کی طرف قدم لئے۔ اسکے چہرے کے رنگ غائب ہو گئے تھے۔

اس سے کچھ فاصلے پہ کھڑے ہوئے اس نے دیکھا حدیبیہ کین کے گلاس سے ٹیک لگائے بازو سینے پہ باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں کچھ تھا کہ براق سارے کا سارا ساکت ہو گیا۔ حدیبیہ چلتے ہوئے آئی اور اسکے قریب آکر رکی۔ اسکی نگاہوں میں کچھ عجیب تھا۔

”اندر چل کر بات کریں براق حاتم؟“ اسے لگا تھا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔ وہ ٹھہر کر اسے دیکھے گیا۔ ساکت بے سانس۔ حدیبیہ نے اسکے بازو میں اپنا بازو ڈالا اور اسکے ساتھ قدم اٹھائے۔ براق کو یوں لگا جیسے وہ اسی کے سہارے چل رہا ہو وہ تو بے جان ہو چکا تھا۔ آفس میں صوفے پہ بیٹھے ہوئے اے سی کی ٹھنڈک میں بھی اسے پسینے آنے لگے۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ اسکے سامنے چھوٹے سے اسٹول پہ بیٹھے ہوئے حدیبیہ مسکرائی۔ اسکی آنکھوں میں سوگواری کی ایک الگ داستان تھی۔

”آپ کی ماں کا قتل ہر راز سے پردہ اٹھا گیا تھا۔ میں جن دنوں خالق حسین کے ساتھ کام کرتی تھی تب سے سب جانتی ہوں۔ چھوٹی سی تو انڈسٹری ہے کس نے کس سے خفیہ نکاح کیا، کس نے اپنا بیٹے کو دنیا میں نام نہیں دیا سب پتہ چل جاتا ہے۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE
 براق کے چہرہ ہر گزرتے لمحے تاریک پڑتا جا رہا تھا۔ یہ ذلت تھی، جس سے وہ ہمیشہ بھاگتا آیا تھا۔ اور آج اسکے بخت میں بھر دی گئی تھی۔ وہ بس چاہتا تھا حدیبیہ چپ ہو جائے۔ ”آپ کی ماں اور انکے تعلقات کافی عرصہ زیر بحث رہے تھے۔“

”کیا چاہتی ہو؟“ اسکی آواز اسکی اپنی نہیں لگتی تھی۔

”وہی جو آپ چاہتے ہیں لیکن مختلف طریقے سے۔ جس میں ”وہ“ بچ جائے۔“ اس نے پینٹ کی پاکٹ سے اپنا موبائل نکالا اور براق کے ہاتھ میں تھمایا۔ سکرین پہ کچھ تصاویر روشن تھیں۔ براق کی وہی

تصاویر جو اسکی شادی کے روز شیزل کو موصول ہوئی تھیں۔ اگلی تصویر میں اس نمبر کی تفصیل تھی جس سے یہ تصاویر بھیجی گئی تھیں۔ وہ مہدی کسیر کا نمبر تھا۔ براق شل رہ گیا۔

”آپ کی محبت کی قبر میں پہلا کیل مہدی نے ٹھوکا تھا باس نہیں نہیں۔ اسکے بعد جو تصاویر آئیں وہ باس کی طرف سے تھیں۔ آپ ان سے اپنا بدل لالے چکے ہیں۔ کیا مہدی کو سب معاف ہے؟“

موبائل ہاتھ میں لئے وہ چپ چاپ ان تصاویر کو دیکھے گیا۔ قیس سے لاکھ اختلاف سہی، لاکھ نفرت اور مقابلے تھے مگر مہدی تو واقعی دوست تھا۔ اور اس ایک لمحے میں وہ سب تھا بس دوست نہیں رہا تھا۔ اور دوست کا دوست نہ رہنا بڑی اذیت ہوتی ہے۔

”پلان بدل گئے تھے مگر نفرت، انتقام اور رقابت وہیں کی وہیں رہی۔“

”بیٹھے بیٹھے یہ پلان کس طرح بدل گیا؟“ میز کے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھنا جو ان بے زاری سے کہہ رہا تھا۔ اسکی طرف پشت کئے کھڑے براق کا چہرہ پر سوچ تھا۔ نگاہیں دیوار پہ جمی تھیں۔ جس پہ جابجا اسکی نوٹس لگے ہوئے تھے۔ کئی تصاویر اور انکو جوڑتے سرخ دھاگے۔ براق اس بورڈ کے آگے کھڑا تھا۔

”اسے گولی لگے گی۔ لیکن وہ مرنا نہیں چاہیے۔“ اسکی آواز ہلکی تھی۔ ”وفارم ہاؤس میں کہیں بھی ہو گا اسے گولیاں لگیں گی۔ مگر وہ مرے گا نہیں۔“

”اور پولیس ہماری ماں ہے ناں؟ جس کو لاش نہیں ملے گی اور وہ ہمارے پیچھے بھی نہیں آئے گی؟“ کمرے کے اندر آتا انسپیکٹر وقار احمد ناگواری سے بولا۔ براق حنیف کے بچپن کا دوست اور قانون کا بکا ہوا سپاہی۔

”پولیس کو لاش ملے گی۔ جلی ہوئی لاش۔ فارم ہاؤس میں آگ لگے گی وجہ شارٹ سرکٹ۔ لاش کسی لاوارث کی ہوگی۔ پانی کی طرح پیسہ بہاؤ اور لاش لے آؤ۔“

”تم پوسٹ مارٹم رپورٹ کو بھول رہے ہو براق۔“ وقار نے اسکی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کروائی۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ قاتل کا اعمال نامہ ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر کسی لاوارث لاش کو پلانٹ کر بھی دیا جائے تو دو منٹ کے اندر اندر پتہ چل جائے گا اسکی موت کی وجہ کیا تھی۔ اور اگر وہ گولیوں سے ہی مرا ہو تب بھی پتہ چلے گا اسکی موت کا وقت کیا تھا اور اسکے جلنے کو کتنے گھنٹے ہو چکے ہیں۔ سائنس بہت آگے جا چکی ہے۔ ایسے قتل نہیں ہوتے جیسے تم سوچ رہے ہو۔ تم کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہو۔ پیسہ بھینکنے سے تماشے دیکھے جاتے ہیں لیکن اگر یاد کرو تو وہ تماشے موت کے نہیں ہوتے۔“

براق پلٹا۔ اسکی آنکھیں اور اسکا چہرہ سپاٹ تھا۔ ”میں پیشہ ور قاتل نہیں ہوں لیکن اس ملک میں امیر لاڈلی اولاد تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خرید سکتا ہوں پورے کا پورا ہسپتال خرید سکتا ہوں۔ میں براق حنیف لوگوں کے ایمان بھی خرید سکتا ہوں۔ وہ اس وقت خود کو ”زمینی خدا مانے بیٹھا تھا۔ اسکا تکبر اسے ایک دن زمین بوس کرے خدا کرے۔“

وقار نے گہری سانس لی۔ وہ براق کے کنٹیکٹس سے واقف تھا۔ اسکی پہنچ اونچی تھی اور طاقت بے مثال جسے آج تک اس نے خاطر خواہ استعمال میں نہیں لایا تھا مگر اب اسکی ضرورت تھی۔ انتقام جنون بنتا جا رہا تھا۔ اور اب براق خود پہ کنٹرول کھو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کمرہ خالی ہوتا گیا۔ پھر نیم تاریک اور پھر گہرا تاریک۔ اسی تاریکی میں کسی کے قدموں کی چاپ نے نوارد کے آنے کا سندیہ دیا۔ کرسی کے کھینچنے کی آواز آئی۔ کوئی براق کے عین سامنے آکر بیٹھا۔ وہ کوئی نہیں تھا مگر وہ کوئی تھا۔ اسکے گرد روشنیوں کا حالہ تھا۔ براق نے کرسی سے سر اٹھا کر اسے ٹکا۔ نگاہوں میں عقیدت تھی۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ ”بابا۔۔۔ میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں وہ کسی سائے سے مخاطب تھا۔ کسی الوژن سے۔“

”تم مجھ سے بہت دور جا چکے ہو براق بہت دور۔ میں نے تمہیں کہا تھا اس سب میں خود کو مت الجھاؤ۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔“ وہ آزرہ لگتے تھے۔

”آپ نے... قیس نے... مہدی اور شیزل... سب نے میرے ساتھ غلط کیا۔ اب میری باری۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”مہدی کیوں؟ اس سب میں وہی کیوں؟“

”وہ ”جڑ“ ہے میں اسے کاٹ کر پھینک دوں گا۔ شروعات وہیں سے ہوئی تھی۔ اسکی ماں اور اسکے غلط اقدام۔ ہمیں قبول کر لیا جاتا اگر اس کی ماں نے روایات نہ توڑی ہوتیں۔ سانپ کا کاٹا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ انہوں نے مجھے اس لئے قبول نہیں کیا کیونکہ وہ ڈر گئے تھے۔ جو کچھ اس عورت نے کیا وہ سب ہم نے جھیلا۔ اور اس سب کے بعد بھی کچھ ٹھیک نہیں ہو سکا۔“

حاتم کی نگاہوں میں دکھ تھا۔ اور ایک عجیب کسک بھی۔ ”خود کو کیوں گرا رہے ہو؟ جو تمہارے پاس ہے وہ بہت ہے۔ زیادہ کی خواہش کیوں ہے تمہیں؟“ وہ کوئی الوژن نہیں تھا وہ براق کالا شعور تھا۔

”زیادہ کہاں ہے بابا؟“ وہ اٹھ کر روشنی کے حوالے کے قریب آیا۔ ”یہ تو bare minimum ہے۔ ان دونوں بھائیوں سے وہ لے رہا ہوں جو انہوں نے مجھ سے لیا۔ قیس نے خاندان لیا اس سے وہی لے لوں گا۔ مہدی نے میری محبت لے لی۔ میں اس سے اسکی محبت لے لوں گا حساب برابر۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ سرد نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔ ”آپ نے مجھ سے میرے حق لئے میں آپ سے وہ لوں گا جس کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ بہت ہو گیاناں۔ سہنے کی طاقت ختم ہو گئی ہے۔“

”نقصان محض تمہارا ہو گا۔ عبد اللہ بادشاہ ہے۔ تخت اسکے قدموں سے کہیں نہیں جائے گا۔ تم پیادے ہو، وہی رہو گے۔“ براق نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ وہ اس آدمی کو نہیں سنے گا نہیں دیکھے گا۔ الوژن ٹوٹ گیا پھر ختم ہو گیا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔

”اور کہانی جب یوژن لے لیتی ہے تو کئی بار سوچ سے زیادہ بدل جاتی ہے۔ پھر پلان ردی، تاویلیں جھوٹ، اور کلا تمکس شروع۔“

فارم ہاؤس کے سامنے زیر تعمیر عمارت کی کھڑکی میں وہی نوجوان بیٹھا تھا جسے تم ایک بار پہلے براق اور وقار کے ساتھ دیکھ چکے ہو۔ اس نے رائفل اسٹینڈ میں سیٹ کر رکھی تھی۔ اب وہ جیب سے ایک پڑیا نکال رہا تھا۔ اس میں سفید ذرات تھے۔ جنہیں وہ کھڑکی میں رکھ رہا تھا۔ پھر جیب سے چابی نکال کر ذرات پیسے۔ پھر چہرہ جھکا کر ناک سے ذرات اندر کھینچے اور اگلے لمحے اسکی دنیا بدل گئی۔

جسم ہوا سے زیادہ ہلکا ہوا، دماغ میں بے انتہا خوشی بھرنے لگی اور جسم میں طاقت سی محسوس ہوئی۔ وہ واپس آکر اسٹول پہ بیٹھا۔ واکی ٹاکی کان سے لگایا۔ ”ٹارگٹ میرے عین سامنے ہے۔ بالکنی میں کھڑا ہے وہ۔ آرڈر دیں باس۔“

دوسری طرف اپنے کمرے میں بیٹھا براق ایک بے حد مختلف انسان لگ رہا تھا۔ اسکا چہرہ زرد تھا۔ بال بکھرے ہوئے، اور اسکا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ ”نشانہ درست رکھنا وہ مرنا نہیں چاہیے۔“ پتہ نہیں کیوں مگر وہ نہیں چاہتا تھا مہدی مرے۔ پہلا قتل مشکل ہوتا ہے۔ یا شاید وہ تعلق کے باقیات تھے؟ ”اسکا دل دائیں طرف ہے گولیاں بائیں طرف لگنی چاہیے ہیں۔ مجھے وہ زندہ چاہیے۔“

”راجر لباس . . .“ اس نے رابطہ منقطع کیا۔ اور دور بین اپنی آنکھوں کے آگے فکس کی۔ اول تو اپنا ہدف دیکھا مگر پھر رخ گھمایا۔ لوگ دیکھے، پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کے آگے آکر کھڑا ہوا۔ یہاں سے اس نے قیس کو دیکھا جو ساکت نگاہوں سے بالکنی کو تک رہا تھا۔ سیاہ، سرخ، سفید، آہ وہ ایک تکتون تھا۔

وہ واپس اسٹول تک آیا اور اب اسکی انگلیوں نے ایک نیا نمبر ملایا۔ وہ قیس کسیر کا نمبر تھا۔ پارٹی میں کھڑا شخص اب موبائل کان سے لگا رہا تھا۔ ”تمہارے بھائی کو گولی مارنے کا پیسہ ملا ہے مجھے۔ لیکن میں اسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ وہ دو انگلیوں کے درمیان اپنی داڑھی کے بالوں کو نوچتے ہوئے بولا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ ”اگر تم مجھے اس رقم کے بدلے ڈبل رقم دے دو تو میں اسے چھوڑ سکتا ہوں۔ کہو پھر چھوڑ دوں یا شوٹ کر دوں؟“ گردن ڈھلکائے واکی ٹاکی کان سے لگائے اور نشانہ لئے ہوئے وہ آخری بازی کھیل رہا تھا۔ بس ذرا سے پیسے اور وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ تھے پیادے کے پیادے۔ کم از کم بادشاہ بے وفا لشکر نہیں رکھتا۔

”کہو پھر چھوڑ دوں یا شوٹ کر دوں؟“ اس نے دہرایا۔ قیس چپ چاپ بالکنی کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مہدی کو اپنے ہاتھوں سے مار سکتا تھا اور مارنے والا بھی تھا مگر وہ اس غرور کو کیسے توڑتا جو اسکی آنکھوں میں تھا۔ اور اس وقت ان دونوں کو ایک دوسرے کے روبرو، ایک دوسرے کے لئے کھڑے دیکھ قیس کو اپنا آپ پاش پاش ہوتا محسوس ہوا۔

”کہو پھر چھوڑ دوں یا شوٹ کر دوں؟ تمہارے پاس اب بھی وقت ہے۔ اپنے بھائی کو بچالو۔“

وہ جسے جنگ میں اپنی طرف سے ملکہ بنا کر لایا تھا۔ وہ سرخ لباس والی اسپر اس سے دغا کر چکی تھی۔ قیس سے جو کھویا تھا اسکی بھرپائی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ پلان، وہ متوقع آگ یہ اسکا پلان نہیں تھا کیونکہ آج شام

تک وہ صدمے میں تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر قتل پلان نہیں ہوتے مگر پلان ہوئے قتل پہ مہر لگ سکتی ہے۔ اور یہ کام وہ کر سکتے ہیں جن کے اندر ابلیس بستے ہوں۔

”چھوڑ دوں یا شوٹ کر دوں؟“

”شوٹ۔“ ایک لفظی حکم۔ دستبرداری، سفاکی یا پھر سر قلمی۔ اس لمحے اس وقت قیس کمبیر نے اپنے بھائی پہ دستبرداری دی کیونکہ اب وہ اسے معاف نہیں کر سکتا تھا اب بس بہت ہو گئیاں؟

چند گھنٹے بعد براق حنیف فارم ہاؤس کے باہر اپنی گاڑی سے اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسکے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اپنے تمام تر کنٹیکٹس استعمال کر لینے کے بعد بھی، پیسہ پانی کی طرح بہا دینے کے بعد بھی اسے خوف تھا۔ بے حد خوف۔ آگے کا پلان واضح تھا۔ اسکے پاس زینیا اور مہدی کا نکاح نامہ تھا۔ قیس اور اسکی زینیا سے محبت کی داستان کی نشانیں تھیں۔ یہ غیرت کے نام پہ ہونے والا قتل ہوتا۔ حسد اور جلن، رقابت اور جائیداد کے تنازعے کا قتل۔ مگر بازی ایسی پلٹ چکی تھی کہ براق حنیف خود بھی بھونچکا رہ گیا۔ یا شاید اس نے اس پلاٹ ٹوئسٹ کو خاصا انجوائے کیا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

قیس کمبیر کے موبائل پہ کچھ میسجز آئے تھے۔ نکاح نامہ، گاڑی کے کاغذات، فلیٹ کا قصہ، اسٹور کے شیراز، طلاق نامے کی تصاویر۔ ایک ترتیب شدہ کھیل، جسے اس نے ترتیب دیا تھا جو کہتی تھی وہ قیس کے ساتھ مخلص ہے۔ حدیبیہ نواز اسکے ساتھ واقعی مخلص تھی۔ وہ قرض دار تھی اور آج قرض اتار رہی تھی۔

قیس اب اسکا ہاتھ پکڑ کر پولیس کے حوالے کر رہا تھا۔ وہ آپا کھوچکا تھا۔ براق نے محض اسکے لئے پھندہ تیار کیا تھا مگر اپنی پسندیدہ عورت کو اپنے ہی بھائی کے قتل کے الزام میں پھنسا کر، اسے زلیل کروا کر قیس نے

خود کو پھانسی خود لگائی تھی۔ اور براق حنیف کو یہ کھیل پہلے والے سے زیادہ پسند آیا تھا۔ مہدی کو زندہ رکھ کر اسے ٹارچر کرنا یہ اس کا خیال تھا جسے عملی جامہ وقت نے پہنا دیا تھا۔

پول کے پانی میں بنتے عکس مٹ گئے۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ براق چند لمحے پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر خود کو ڈھیلا چھوڑا، اور اگلے لمحے پیٹھ کے بل خود کو پانی میں گر ادیا۔ یوں جیسے اس سے باہر نکلے گا تو پہلے جیسا ہو گا۔ ہاہ منافق۔

کراچی پاکستان۔

دادی کی وفات کو کئی دن بیت چکے تھے۔ پولیس وقتاً فوقتاً نواب خاندان کے مختلف افراد کو لے کر جاتی، تفتیش کے نام پہ انہیں مارنے کے خوف دلاتی اور یہاں نواب پیسہ پھینکتے۔ تعلقات کا زور دکھاتے اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ایک اور چیز کی تبدیلی آئی تھی بشر اور ضیغم کا بیان پولیس کے سامنے بدل چکا تھا۔ انہوں نے زینیا حاکم کے متعلق لاعلمی ظاہر کی تھی۔ بقول انکے وہ سمندر برد ہوئی یا اسے آسمان نے نگلا کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ البتہ انہوں نے پولیس کے خلاف ایف آئی آر ضرور کٹوائی تھی کہ انکی بہن پولیس افسران سے کیسے غائب ہوئی۔

ایس پی آفس میں بیٹھے ہوئے قیس کسیر کا چہرہ وہ نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اس شہر آیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اس شخص کے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ وقت نہیں اسکے ہاتھوں سے دنیا ریت کی مانند نکلتی جا رہی تھی۔

”یعنی کیا شہیر صاحب؟ میں یہ سمجھ کر واپس چلا جاؤں کہ دو شہروں کی پولیس ایک قاتلہ کا سراغ نہیں لگا سکی۔“

”اس پہ قتل ثابت نہیں ہوا۔“ دائیں طرف بیٹھے وریام نے اسکی بات کاٹنا اپنا فرض سمجھا۔ ”میں اس کیس کا تفشیشی افسر ہوں۔ اور پورے عرصے میں ایک بار بھی اس پہ کچھ ثابت نہیں ہوا۔ لیکن وہ پولیس حراست سے بھاگی ہوئی ملزمہ ضرور ہے۔“ شکریہ سرکار جو آپ نے اتنا مان لیا۔

”بھاگی ہوئی یا بھگائی گئی؟ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ میں نے تمھیں گاڑیوں کو آگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ قیس کے لہجے میں طیش بھرنے لگا۔ ”مجھے وہ لڑکی چاہیے۔ پولیس اگر اپنا کام ٹھیک سے کرتی تو آج یہ سب نہ ہو رہا ہوتا۔“ اس نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔

ایس پی شہریار خان نے گہری سانس لی اور اس سکی ڈیزائنر کو دیکھا۔ جس کے آگے پیچھے مضبوط ہاتھ تھے۔ دو طاقتور خاندانوں کے درمیان پولیس گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔ ”پورا کر اچی چھان لیا ہے کمبیر صاحب۔ گھر والوں سے بھی پوچھ گچھ کر لی اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہم مزید کیا کریں؟“

”انکے گھر کی عورتوں کو اٹھائیں۔“ وہ ترنت بولا۔ ”جس لڑکی کے موبائل سے آخری بار ضیغم کو کال اور لوکیشن آئی تھی اسے اٹھائیں۔ جن کے ساتھ آخری بار زینیا کو دیکھا گیا اسکی بیوی اٹھائیں۔“ میز پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے وہ آگے ہوا۔ ”تعاون کریں ایس پی صاحب۔ آپ کے بیٹے کو اسکی پسند کا گھر مل سکتا ہے۔ ایک ڈیڑھ کروڑ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اسکی آواز بے حد ہلکی تھی کہ بامشکل شہریار سن سکا۔

”وہ صرف اٹھارہ سال کی بچی ہے۔ پولیس اسے کس بنا پہ اندر کر سکتی ہے؟“ وریام بیچ میں بولا۔ (اب کیا انکے گھر کی ساری عورتوں کا محافظ میں بنوں گا؟)

”اس بنا پہ کہ ملزمہ کے متعلق آخری بار رابطہ اسی کا ہوا تھا۔ اور اسکے پاس وہ لوکیشن تھی جہاں اسکے اپنے منگیتر کے مطابق ملزمہ کو لے کر جایا گیا اور میں نے آخری بار اسے وہیں دیکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کوئج حاکم کا اس کیس سے تعلق ہے۔“ اب کے نواز بولا تھا۔ سندھ پولیس سے وہی اس کیس کو لیڈ کر رہا تھا۔

”دیکھیں کمبیر صاحب۔“ شہریار نے تحمل سے کہنا شروع کیا۔ ”دوسری طرف نواب صاحب کا خاندان ہے۔ ہم اس طرح انکے گھر کی عورتوں پہ ہاتھ ڈالیں گے تو معاملات بگڑ سکتے ہیں۔ میں آگے بھی جواب دہ ہوں۔ دو بڑے بڑے خاندانوں کے درمیان ہم پس کر رہ جائیں گے۔“

”اور نوابوں کو کون بتائے گا یہ آپ کے حکم سے ہوا ہے؟“ قیس اسی کے انداز میں بولا۔ وریام نے آنکھیں گھمائیں۔ (اللہ کی قسم میں بتاؤں گا) ”چند سپاہیوں کو بھیجیں۔ آپ پہ کوئی بات آئے تو کہہ دیجئے میرے آرڈر نہیں تھے۔ سپاہی چند دن کے لئے سسپنڈ کر دیجئے۔ یہ سب اتنا مشکل تو نہیں ہے ایس پی صاحب۔ اور یہ مت بھولیں آپ کے پیچھے میں کھڑا ہوں۔“ ایس پی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر بہ دقت سر کو اثبات میں ہلایا۔

”آپ سے تعلقات ہیں کمبیر صاحب آپ کے لئے کچھ بھی۔“ مسکراتے ہوئے کہا۔ وریام نے دانت پہ دانت جما کر ضبط کیا۔ (ایک کروڑ کے گھر کے لئے ایمان بیچ دیا خبیث نے) وہ ایک بار پھر دل ہی دل میں بولا۔ قیس کے اندر کچھ تقویت اتری ورنہ کوئی اس سے پوچھتا جب کراچی کی ہر گلی کوچے، ہر جگہ وہ اسے

ڈھونڈتا پھر رہا تھا تب اسکی حالت کیا ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ خوف دل میں کنڈلی مار رہا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ پائے گا کیا؟

ایس پی آفس سے باہر نکل کر کراچی کے کئی بازار، محلے، گلیاں، بنگلے لتاڑ کر اس ٹرپل سٹوری گھر میں آؤ تو وہاں خاموشی کا راج تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کمروں میں گھسا پیکنگ کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس شہر کو الوداع کہنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ بری لڑکی جس نے خاندان کی عزت پہ بٹہ لگایا تھا وہ اب نہیں رہی تھی۔ اب تو دنیا اس خاندان کو سر آنکھوں پہ بٹھائے گی۔

سر دیوں کی اس اداس شام میں وہ چھت کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھیں موند رکھی تھیں جن سے آنسو بہہ کر اسکے چہرے کو گیلا کر رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور حلیہ بے ترتیب تھا۔ کونج حاکم کا واحد سہارا، اسکے غموں میں شریک، اسکی مسیحا عورت اور وہ شفیق لمس اس سے کھو گیا تھا۔ ایسے جیسے ہاتھوں سے دنیا سرک گئی ہو۔ دفعتاً اس نے کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں، اور سراٹھایا۔ وہ نرم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کونج کی پلکوں پہ ٹھہرے آنسو، متورم آنکھیں ضیغ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مزید روانی سے رونے لگی۔

”اس طرح کونے کھدروں میں چھپ کر رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو۔“

وہ مزید تیزی سے رونے لگی۔ ضیغ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ ”وہ میرے لئے سب کچھ تھیں۔ میری ماں، میرا باپ، میری دوست۔ میں کیا کروں گی انکے بغیر؟“ بھل بھل بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ بامشکل بول سکی۔ ”سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا میرا تو سارا دن انکے ساتھ تھا میں... میں کیا کروں گی؟... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

وہ اسکے سامنے فاصلے پہ آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا۔ کونج کے شکوے سنے، اسے روتے ہوئے دیکھا۔ غصہ، غبار، غم وہ لڑکی جو اتنے دنوں سے سب سہہ رہی تھی۔ سب آہستہ آہستہ دل سے نکل گیا۔

”جانے والے واپس نہیں آتے کونج۔ انکا جانا اسی طرح طے تھا۔ ہمارے خاندان نے بہت کچھ جھیلنا ہے۔ تم خود کو اس طرح کمزور مت کرو۔ یہ وہ وقت ہے جب تمہیں یاد کرنا ہے تم کون ہو؟“

”اور کون ہوں میں؟“ وہ بری طرح مشتعل ہوئی۔ ”میں بہت عام سی لڑکی ہوں۔ حالات کا مقابلہ کرنا نہیں آتا مجھے، وقت سے لڑنا نہیں آتا۔ میں چیزوں سے، حادثات سے جلدی موو آن نہیں کر سکتی۔ میں زینیا حاکم نہیں ہوں۔“ آخر میں وہ چیخ کر بولی۔

”کیونکہ تم کونج حاکم ہو۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”تم وہ ہو جس نے ایک بلیک میلر سے اپنی جان چھڑوائی۔ دادی صرف اتنا جانتی تھیں کہ تم نے اسے کہا تھا اگر وہ چاہے تو تمہاری تصاویر لیک کر دے لیکن میں کچھ اور بھی جانتا ہوں۔“ وہ رکا۔ اسکی آنکھوں میں کوئی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ”تمہارے پاس فریج کی تصاویر تھیں اور تم نے اسے کہا تھا جس دن تمہاری تصاویر انٹرنیٹ پہ آئیں اسی دن فریج کی تصاویر بھی ہر موبائل کی زینت بنیں گی۔“ کونج جھینپ گئی۔ وہ کہتا رہا۔ ”تم نے پورے ایک سال کسی سے فون کالز پہ بات کرنے کی عادت کو نکالا کیونکہ وہ ایک غلط کام تھا۔ تم نے تکلیف جھیلی، بے چین ہوئیں لیکن تم نے دوبارہ اس لڑکے سے کنٹیکٹ نہیں رکھا جو تمہارا منگیتر تھا۔ دنیا کی نظر میں تم غلط نہیں تھیں لیکن تم نے اپنا ضمیر بچایا۔ بات صرف یہ ہے کہ تب تم ثابت قدم تھیں۔ تب تم فوکسڈ تھیں۔ دنیا کی نظروں میں زینیا مضبوط ہے تو کمزور کونج بھی نہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ حالات گزر جانے کے بعد روتی ہے اور تم پہلے۔ تم دونوں کا تم دونوں جیسی لڑکیوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تم بس مختلف ہو۔ کوئی اعلیٰ نہیں کوئی کمتر نہیں۔ آدھی دنیا کونج ہے آدھی زینیا۔ بس۔“ اس نے جیسے حتمی فیصلہ کیا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ”وہ کہاں ہے ضیغم؟ سب کہتے ہیں تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ کیا تم نے واقعی؟“ وہ آگے کچھ نہیں کہہ سکی۔ ضیغم نے اپنے آس پاس دیکھا اور لہجہ دھیمار کھا۔

”تم نے منع کیا تھا، تمہاری حکم عدولی کیسے کر سکتا تھا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

کونج نے رخ پھیرا۔ ہاں مگر دل کو تھوڑی بہت تسلی ہوئی تھی۔ ”مجھ سے امیدیں مت رکھنا۔ ان منگنیوں سے میرا یقین اٹھ گیا ہے۔“

ضیغم نے گہری سانس لی۔ ”دیکھو یا یہ جو زینیا اور عبداللہ کی منگنی تھی ناں یہ شروع سے intense تھی۔ کیونکہ اسکے پیچھے، اسکے دائیں بائیں سازشیں تھیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے بلوچستان کے لوگ اتنے ظالم ہیں، اتنے اجڑا اور گنوار ہیں کہ اس طرح ایک منگنی کے پیچھے لڑتے ہیں، قتل کرتے ہیں؟“ اس نے گردن نفی میں ہلائی۔ ”بلوچستان سمیت دیگر صوبوں میں آج بھی نام نہاد غیرت پہ قتل ہو رہے ہیں۔ آج بھی مرد خیبر کے کچھ علاقوں میں ”نگ“ (نگ میں کوئی مرد کسی لڑکی کے گھر کے باہر فائرنگ کر آتا ہے اور اسکے بعد اس لڑکی سے کوئی اور شادی نہیں کر سکتا۔ وہ چاہے تو شادی کرے ورنہ وہ لڑکی یو نہی گھر بیٹھی رہے) جیسی لعنت پہ یقین رکھتے ہیں۔ پنجاب کے کچھ علاقے آج بھی ”ونی“ (اگر دو خاندانوں

کے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے اور اسکی بنا پہ کوئی قتل ہو جائے تو قاتل کی بہن یا بیٹی کو مقتول کے گھر کی ”ونی“ کر دیا جاتا ہے۔ ونی کے ساتھ ہونے والا سلوک کسی جانور سے بھی بدتر ہوتا ہے) پہ یقین رکھتے ہیں۔ سندھ اور بلوچستان میں آج بھی ”کاروکاری“ کی روایت ہے۔ یہ صرف ہمارا علاقہ نہیں ہے یہ دیمک ہے جو ملک کے تیس فیصد حصے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ یہ کوئی روایت نہیں ہے یہ چند بے غیرتوں کے بنائے گئے بے غیرت قوانین ہیں۔ خود سوچو یہ کیسی غیرت ہے کہ جس میں پسنے والی محض عورت ہے؟“ اس نے لمحے کا توقف کیا۔ کونج غور سے اسے سن رہی تھی۔

”آج کل منگنی ہونا اور ٹوٹ جانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں رہا۔ تم گھر پہ بیٹھی ہو باہر نکل کر دیکھو بلکہ تمہارے نزدیک تمہاری دوستوں میں کسی کی منگنی نہیں ٹوٹی؟ کسی کی شادی نہیں ٹوٹی پھر کیا سب عبد اللہ زمان بن گئے؟“ کونج نے نفی میں سر ہلایا۔ ”عبد اللہ اور ہمارا خاندان طاقت ور ہے، بس اسی لئے مسائل ہوئے۔ اور چند جھوٹی نام نہاد روایات نے اسے شہہ دی لیکن ہماری منگنی نارمل ہے اور رہے گی۔“

کونج نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ضیغم کراہا۔ ”یہ واقعی نارمل ہے۔ جو مسائل تھے وہ زینیا اور بالاج بھائی کے تھے اور عبد اللہ کے۔ ہم تو ماشاء اللہ خوش ہیں۔“ وہ اس انداز سے بولا کہ کونج ہنس پڑی۔ ”تم کچھ زیادہ خوش ہو ظاہر ہے اتنا ہینڈ سم لڑکا ہر کسی کو تھوڑی ملتا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”خیر میں چلتا ہوں یہ مت سوچنا تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آیا تھا۔ میرا اپنا کام تھا یہاں۔“

”بلکل چھت بہت گندی ہو گئی ہے جھاڑو لگانے آئے تھے ناں؟“ ضیغم نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر رک گیا۔ سیڑھیوں سے دھپ دھپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کونج کی طرف بڑھا مگر وہ کوئی حفاظتی بند نہیں باندھ سکا۔ خواتین پولیس کے ساتھ کچھ مرد افسر اوپر آئے تھے۔ انہوں نے کھینچ کر کونج کو اٹھایا، ایک مرد نے ضیغم کو گھسیٹا۔ اور انہیں اپنے ساتھ لیتے ہوئے چلے گئے۔ نیچے صحن سے ضیغم کی بہن بھی انکی حراست میں تھی۔ گاڑیوں کی طرف جاتے، ماؤف ہوتے ذہن اور دھندلی ہوتی آنکھوں سے جو کونج نے آخری چہرہ دیکھا وہ قیس کسیر کا تھا۔ واقعی قیس کسیر کا یا جنون کا؟

ہاسٹل کے کمرے میں بے ترتیبی تھی۔ شیزل بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ اسکی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پہ مغموم
 تاثر تھا۔ کمرے میں واحد روشنی وہ تھی جو موبائل سے اسکے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ اس کے بیڈ کی سائیڈ
 ٹیبل پہ کافی کا بھرا ہوا گلاس رکھا تھا جسے اس نے چھوا تک نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف
 کیں۔ آنکھوں کے آگے بار بار وہ منظر تھا جس میں پولیس بشر اور ضیغم کو ساتھ لئے جا رہی تھی اور انکے
 کپڑے خون آلود تھے۔ پہلی اطلاعات کے مطابق ان دونوں نے غیرت کے نام پہ زینیا کا قتل کر دیا تھا۔ وہ
 یقین نہیں کرنا چاہتی تھی کہ یہ نہیں سکتی تھی۔ موبائل پہ ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس نے کال
 ملائی۔ موبائل کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے ایک اچھے جواب کے لئے وہ ہرگز پر امید نہیں تھی۔
 پولیس موبائل میں بیٹھتے ہوئے وریام بیگ کا موبائل بجا۔ اس نے کال اٹینڈ کر کے موبائل کان سے
 لگایا۔ ”ہیلو؟“

Safar-e-Adab

وہ عجلت میں لگتا تھا۔

”کال مٹ کاٹنا وریام“ وہ جلدی سے بولی مبادہ کال کٹ ہی نہ جائے۔ ”مجھے تم سے بہت ضروری
 بات کرنی ہے۔ میں شیزل سیمسن بات کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنے آس پاس دیکھا اور کال کاٹ
 دی۔ پھر خود بھی موبائل سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر پینٹ کی پاکٹ سے چھوٹا موبائل نکالا اور اسی نمبر پہ
 کال ملائی جس سے کچھ دیر قبل اسے کال آئی تھی۔ (وریام پہ پولیس انکوائری بیٹھنی تھی وہ جانتا تھا اسکی کالز
 ٹیپ کی جائیں گی۔ اس موبائل پہ جو سم تھی اسکا مالک چار ماہ پہلے مرچکا تھا۔) اللہ جنت میں جگہ دے سم
 استعمال کرنے سے پہلے وریام نے اسے دعا دی تھی۔)

شینزل کال کٹ جانے پہ اسے بار بار کالز ملارہی تھی مگر اسی پل اسے ایک انجان نمبر سے کال موصول ہوئی۔ اس نے کال اٹینڈ کر کے موبائل کان سے لگایا۔ ”کیا بات ہے بی بی؟ پہلے تو مرد بدنام تھے اب عورتیں مردوں کو ہراساں کرنے لگی ہیں کیا؟ کیوں کالز کئے جارہی ہیں؟“ وہ بری طرح بھڑکا۔

”قیس میری کالز نہیں اٹھا رہا۔ زینیا کے گھر میں سب کے فون بند آرہے ہیں میں . . .“

”تو میری اولادیں ہیں وہ سب؟ یا اٹھیکا لیا ہے میں نے انکا؟ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ وہ ہنوز بے زار نظر آتا تھا۔

”مجھے زینیا کے بارے میں پوچھنا ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ وہ زندہ۔“ وہ اسکی پچھلی ہر بات کو بھول کر بس یہی پوچھ رہی تھی۔

”آخری اطلاعات تک میری ماں کا نام زینیا نہیں تھا۔ پھر مجھے اسکے متعلق کیوں پتہ ہوگا؟“

”تم میری مدد کرو، میں بدلے میں تمہاری مدد کروں گی۔“ شینزل نے ہونٹ کاٹے۔ گہری سانس لی۔ ”مجھے صرف اسکی خیریت کی اطلاع دے دو۔“

”معذرت بی بی۔ رابن ہڈ کے مامے کی روح میرے جسم میں نہیں رہی۔ نہ مدرٹریسا سے میرا کوئی تعلق ہے، اور نہ میں نے ساری دنیا کی عورتوں کی مدد کاٹھی لیا ہوا ہے۔ ایک کی مدد کر دی تو اب تک جھیل رہا ہوں۔“

شینزل چند پل چپ رہ کر ہونٹ کاٹتی رہی۔ پھر جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔

”میں وہ پہیلی سمجھ گئی ہوں جو تمہیں زمینا نے بتائی تھی۔“ اس سے پہلے کہ وہ فون کا ٹائٹل نے اسے ساکن کر دیا۔ ”میں تمہیں اس آدمی تک لے کر جاسکتی ہوں جو تمہارا مجرم ہے۔ کیونکہ وہ میرا سب سے قریبی ہے۔ صرف ایک بار میری مدد کر دو بدلے“ میں تمہیں وہ ملے گا جسے تم ڈھونڈ رہے ہو

وریام ٹھہر گیا تھا۔ کئی لمحے دونوں طرف خاموشی رہی۔ ”وہ صرف دوست نہیں ہے۔ وہ میرے لئے بہت کچھ ہے۔ صرف اتنا بتاؤ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ بس صرف اتنا۔“ اسکی آنکھیں ایک بار پھر چھلک پڑیں۔ چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اسکی آواز دوسری طرف نہیں جاسکی۔

”گھاک عورت ہے وہ۔ اسکا کزن اس پہ بدوق تانے کھڑا تھا اور وہ اپنے حق میں بول رہی تھی۔ میں اس پہ جملے کس رہا تھا تب اس نے سہا۔ قیس نے جب اسے ذلیل کرنا چاہا تب اس نے ساری دنیا پہ راز کھول دیا کہ وہ آدمی آگ سے خوف زدہ ہے۔ گولی لگے ہوئے بازو سے پولیس کی تین گاڑیوں کو آگ لگا کر، اپنے ہی منگیتر کا ٹراما استعمال کر کے بھاگی ہے وہ تمہیں لگتا ہے وہ مر گئی ہوگی؟“

شیزل بے آواز رونے لگی۔ یعنی وہ خون... وہ خون اسکے بازو پہ گولی لگنے کا تھا۔ بشر نے اسے نہیں مارا وہ مار ہی نہیں سکتا۔ ”وہ کبھی کسی دن کہیں سے نمودار ہو سکتی ہے۔ ہو جائے تو پولیس کو اطلاع دینا۔ مفروضہ ملزمہ ہنہ۔“ اس نے کال کاٹ دی۔ شیزل نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اسے بے تحاشہ رونا تھا اس لئے کہ زینیا حاکم آزاد تھی۔ یہ آنسو اسکی جیت کے نام۔

وہ اس کے ساتھ نہیں تھی لیکن آزاد تھی۔ اسکی خیر خبر نہیں تھی لیکن وہ میدان جنگ سے دور تھی۔ دوست چھوٹ گئی تھی مگر کم از کم زندہ تھی۔ یہ بہت تھا بہت زیادہ۔

اسکی آنکھ کھڑپڑ کی آواز کے ساتھ کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے اپنے اطراف میں دیکھتی رہی پھر اسکا دماغ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا۔ وہ چھوٹا سا کمرہ اور اسکے کم سامان اسکی نگاہوں کو ازبر ہی ہو گئے تھے۔

”معذرت بچے، مگر تمہیں جگانا ضروری تھا۔“ مہربان چہرے اور آنکھوں میں نرم تاثر لئے وحید کہہ رہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ زینیا خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ”میرا کام ہو گیا ہے کل صبح مجھے نکلنا ہو گا۔ اس سے پہلے تم سے کچھ بات کرنی ہو گی۔“

”اور میں؟“ پورے ڈیڑھ دن بعد وہ بلاخر ایک لفظ بولی تھی۔ ”میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ چاہ کر بھی وہ اپنے لہجے میں پہلے جیسی تمکنت نہیں پیدا کر سکی۔ کچھ تھا جو اسے پسپا کر رہا تھا۔ شاید اس سے اسکا غرور لیا گیا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”تم میرے ساتھ نہیں جاسکتیں۔“ وہ اسی نرمی سے کہتے ہوئے اسکے سامنے آکر بیٹھا۔ زینیا نے نا محسوس انداز میں اپنا بیگ قریب کیا۔ ”تمہارے لئے یہیں بندوبست کر لیا ہے۔ اس لئے اب تم ان لوگوں کو اپنا خاندان سمجھنا، ان ہی سے تعلق رکھنا اور انکے گرد خود کو محفوظ سمجھنا۔“ وہ کچھ سامان باہر نکال رہا تھا۔ زینیا نے بیگ میں ہاتھ مار کر کچھ تلاشنا چاہا مگر وہ ٹھٹھک گئی۔ یہ بیگ اسی کا تھا مگر اندر محض کپڑے تھے، صرف کپڑے۔ اس آدمی پہ اسکا شک گہرا ہوا۔

”آپ کا سامان کسی کر منل کے سامان جیسا تھا، جسے پورٹ پہ نہیں لایا جاسکتا تھا۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ جلد واپس کر دوں گا۔“ وہ اسکی طرف دیکھے بغیر بولا۔ زینیا بالکل ٹھہر سی گئی۔ یہ آدمی جو دیکھ رہا تھا وہ کیوں نہیں دیکھ پارہی تھی؟

”مجھے میرا سامان چاہیے ابھی کے ابھی اور میں یہاں کسی غیر ملک میں کسی اجنبی کے ساتھ بالکل نہیں رہنے والی۔ آپ دھوکے سے مجھے یہاں لائے ہیں ورنہ میرا بھائی مجھے مر کر بھی یہاں بھیجنے کی غلطی نہیں کرتا اس لئے مجھے واپس میرے ملک لے کر جائیں۔ ورنہ میں پولیس کے پاس جاؤں گی اور“

”تم پولیس کے پاس جاسکتی ہو؟“ وہ ہنوز گردن جھکائے دوا کی شیشیوں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ”جاسکتی ہو تو شیور ضرور جاؤ۔ لیکن بس ایک بات ذہن میں رکھنا، آدھی دنیا تمہیں قاتلہ کے طور پہ جانتی ہے۔ اور باقی کی آدھی دنیا کو اگر تم الیگل امیگرینٹ کے طور پہ جانے جانا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نقصان صرف تمہارے کھاتے میں آئیں گے۔“

اسے وہیں بیٹھے بیٹھے احساس ہوا کہ کسی نے اس سے کھڑے ہونے کی قوت چھین لی ہے۔ وہ پہلے والی زینیا حاکم کہاں رہی تھی؟

”تم نے زندگی مانگی تھی وہ تمہیں مل گئی ہے اور اب اسے کیسے گزارنا ہے یہ تمہیں سیکھنا ہو گا۔ تم نے جہنم سے رہائی مانگی تھی تمہیں مل گئی ہے۔ اب اس جہنم میں کیسے سروائیو کرنا ہے یہ تمہیں سیکھنا ہو گا۔ یاد کرو تم کون ہو پھر چیزیں بدل جائیں گی۔ تم خود کو پہچانو، پھر حالات آسان ہو جائیں گے۔ تم بھول گئی ہو تم کون ہو۔ یاد رہے کرو۔“ زینیا وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے جیسے سانس نہیں آرہا تھا۔ کھڑکی کے قریب

کھڑے ہو کر اس نے پردے ہٹائے۔ تازہ ہوا کا جھونکا اسکے چہرے سے ٹکرایا، مگر یہ ہوا اسے یہ ہوا تک غیر لگی۔ لوگ، گھر کچھ بھی تو اسکا نہیں تھا۔

”اس ملک میں تمہارے لئے اب کچھ نہیں رہا۔ پولیس تمہاری بہن اور کزنز کو تھانے لے گئی ہے۔ انکی زندگی برباد ہونے والی ہے کیونکہ تم نے اپنی زندگی بچائی۔“ زینیا نے اتنی زور سے گردن پھیر کر اسے دیکھا یہاں تک کہ گردن کے چٹختنے کی آواز آئی۔ ”تم جانتی تھیں تمہارے غائب ہونے کے بعد وہ آدمی سکون سے نہیں بیٹھ سکے گا۔ تم جانتی تھیں تمہارا خاندان مسائل سے نہیں نکل سکے گا لیکن تم نے پھر بھی اپنی زندگی مانگی.....“

”میری بہن.....“ اسکے لب ہولے سے پھڑپھڑائے۔ ”کوئج تو بہت معصوم ہے۔“ اسے جیسے اب ادراک ہوا وہ آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوئی۔

”زندگی مانگنا غلط نہیں تھا لیکن اب ایک بار پھر خود غرضی دکھانا غلط ہے۔ واپس جانے پہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہاں رہو گی تو ایک غم ہو گا۔ وہاں جاؤ گی تو ہزار۔ اپنوں کے درمیان تمہاری کوئی پہچان نہیں ہو گی۔ قانون کی بے عزت کرنے پہ تم ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے ہو گی۔ تمہارا سارا خاندان اس وقت تمہیں مردہ مان چکا ہے۔ تمہاری واپسی انہیں مار دے گی۔“

کھڑکی سے آتی جامنی کرنیں اسکے چہرے پہ پڑے زخم واضح کر رہی تھیں۔ اسکی آنکھ سے گرتے قطرے اسکی گردن تک جلا رہے تھے۔ ذلت، جسمانی تکلیف، محبت سے دوری کے بعد کیا اب اسے بن باس بھی دیکھنا تھا؟ کسی اور ملک میں چوروں کی طرح چھپ کر رہنا تھا کیونکہ عبداللہ زمان نے اس پہ جھوٹے

الزامات لگائے تھے؟ کیونکہ عبداللہ زمان نے انتقام لئے تھے۔ اگر وہ کبھی واپس آگیا تو؟ کیا وہ اسے معاف کر بھی سکے گی؟

”میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ سمجھنے کی کوشش کریں میں یہاں کیسے رہوں گی؟“ وہ تیز تیز کہتے ہوئے انکے سامنے آئی۔ اسکے چہرے پہ ہر اس اساں سا تاثر تھا۔ ”یہ میرا ملک نہیں ہے یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ، کلچر یہاں کچھ بھی میرا نہیں ہے۔ میں اپنے ملک میں کہیں بھی جگہ رہ لوں گی۔ پلیز مجھے یہاں سے نکالیں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے انکی زبان نہیں آتی مجھے میں . . میں“ الفاظ کھو گئے، رنج بڑھ گیا اور اس نے ہمت ہار دی۔ ”آپ مجھے یہاں سے لے جائیں پلیز مجھے لے جائیں۔ پلیز۔“

وحید کے چہرے پہ کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی فلم کا منظر ہو۔

”میں یہاں نہیں رہ سکتی ایک الیگل کے طور پہ میں یہاں کیا کروں گی؟ میں کوئی نوکری نہیں کر سکتی میں کہیں جا نہیں سکتی۔ کسی بڑی بیماری میں میرا ٹریٹمنٹ نہیں ہو سکتا میں مر جاؤں گی یہاں پلیز . . . پلیز مجھے یہاں سے نکالیں پلیز۔“ اس پہ ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ وہ بری طرح ہچکیاں لیتے ہوئے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے میرے ملک واپس جانا ہے میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

وحید نے اسکے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر وہی ہاتھ جیب میں ڈال کر اپنا موبائل باہر نکالا۔ چند بٹن دبا کر موبائل بیڈ کے کنارے رکھا۔ وہ جو پنچوں کے بل بیٹھی تھی اب اسکے چہرے پہ موبائل کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پہلی ویڈیو میں اسکے گھر سے چند لڑکیوں کو پولیس موبائل میں بٹھایا جا رہا تھا۔ وحید نے انگلی سے دوسری ویڈیو پلے کی۔ وہاں بشر، ضیغ خون سے لت پت کپڑوں کے ساتھ، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گاڑی سے اتر رہے تھے۔ وہ پولیس کی چار روزہ حراست سے واپس آئے تھے۔ اگلی ویڈیو کراچی، اسلام آباد کے

گلی، چوک کی تھی۔ ہر ہر جگہ اسکی تصاویر لگی تھیں۔ اس ڈھونڈ کر لانے والے پہ انعام تھا۔ اسکے قدموں سے یلکھت جان نکل گئی اور وہ زمین بوس ہوئی۔ اسکے سر سے کسی نے آسمان کھینچ کر دیا کسی نے اسکا سر برہنہ کر دیا۔ زینیا حاکم سے وہ لیا گیا تھا جسے پانے کے لئے اس نے عمریں خاک کی تھیں۔

”یہ ہے وہ قیمت جو تمہارا بھائی، بہن، کزن تمہاری آزادی کے لئے چکا رہے ہیں۔ کیا مشکل تھا انکے لئے کہ تمہیں قتل کر دیتے اور لاش پولیس کے حوالے چند ایک سال کی قید کے بعد وہ آزاد ہوتے مگر انہوں نے تمہاری زندگی چنی۔“

”میرا ساتھ نہیں“ وہ بڑبڑائی۔ پھر رو پڑی۔

”کیا تم خود ساتھ چاہتی تھیں؟ تم نے صرف زندگی مانگی تھی، اور وہ تمہیں مل گئی ہے۔ میں تمہیں واپس لے جاؤں گا اگر تم چاہو لیکن پورٹ پہ جاتے ہی پولیس تمہیں حراست میں لے لے گی تمہیں یہاں لانے میں، میں نے اپنے سارے کنٹیکٹس استعمال کر لئے ہیں اب یہاں سے واپسی پہ میں کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں لے رہا۔“ اس نے موبائل اٹھا کر واپس جیب میں ڈالا اور ایک نظر فرش پہ بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ساکت اور سن تھی۔

”مجھے چاہیے تھا تمہیں نہ بتاتا . . . لیکن . . .“ وہ ایک لمحے کور کے، زینیا نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”تمہاری دادی کا انتقال ہوئے چھ دن بیت چکے ہیں۔“

اس نے وہ سنا جسے وہ کم از کم ہو اس صدی میں نہیں سنا چاہتی تھی۔ سنہری آنکھوں والی لڑکی کے لئے ساری دنیا جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ اور اس نے اسی راکھ کے اندر خود کو مدفن پایا۔ وہ ٹکر ٹکر اس آدمی کا چہرہ دیکھے گئی۔ مسیحا یا موت، کون تھا وہ؟

تھانے کی اس کو ٹھڑی میں تین سے چار لڑکیاں سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھیں۔ چادر سے اپنے وجود چھپائے، نگاہیں فرش پہ مرکوز کئے وہ تمام لڑکیاں آس پاس دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔ انہی میں سے ایک کونج حاکم بھی تھی۔ اسکے ذہن میں صرف ایک بات گھوم رہی تھی۔ جسے وہ جتنا چاہے جھٹکتی اتنا یاد آتی۔

کیا تمہیں یہ معلوم ہے تم کون ہو؟ یاد کرو تم کون ہو۔ . . یاد کرو تم کون ہو۔

”کچھ لوگوں کے پاس سب کچھ ہوتا ہے نا؟ بالکل ایسے جیسے وہ لوگ بلیسڈ ہوں۔“ لیپ ٹاپ سامنے رکھے وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”آپ کو پتہ ہے میں نے اپنا بہت خیال رکھا۔ اپنی اسکن کا، اپنی روٹین کا اور بھی بہت کچھ مگر کچھ مسنگ ہے۔ مجھے اب بھی لگتا ہے ”فلاں“ مجھ سے بہتر ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا کرزما ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہم عام لوگ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔“

مظفر نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کونج، تمہارا مسئلہ لوگ نہیں ہیں۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے۔ اس نے کنپٹی پہ انگلی سے دستک دی۔“ خوشبو میں رچے بسے، مہنگے کپڑے پہننے والے لوگ بلیسڈ ہوتے ہیں۔ یہ سوچ ہے صرف۔ لوگوں کو قریب سے جاننے لگو گی تو ان سے خوف کھاؤ گی۔ ایک لفظ ہے ”اعتماد“ انسان کے اندر اگر یہ ایک لفظ رچ بس جائے تو اسے کوئی چیز مرعوب نہیں کر سکتی۔“ وہ رکا۔ کونج کے تاثرات جانچے پھر کہنے لگا۔ ”انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے مرعوب ہوتا ہے کیونکہ اسکا دماغ بار بار اسے بتاتا ہے تم میں کوئی کمی ہے۔ تم درست بول نہیں رہے۔ تم زیادہ ہنس رہے

ہو، اوہ اب تم انگلیاں کیوں مروڑ رہے ہو، اوہ تمہارے تو کپڑے اچھے نہیں ہیں۔ یہ سب ایک بیمار دماغ کرتا ہے۔“ اس نے میز پر دھراؤن کا گولہ اور باقی سامان لئے۔ شاید وہ کچھ بننے کی تیاری کر رہا تھا۔

”بیمار دماغ کیسا ہوتا ہے؟ میرا دماغ بیمار ہے؟ کیونکہ مجھے ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے۔“ کوچ ٹرنٹ بولی۔ لیپ ٹاپ کو گود میں مزید گھسالی۔

”بیمار دماغ وہ ہوتا ہے جسے خود سے زیادہ لوگوں کی پرواہ ہوتی ہے۔ فلاں بند مجھے دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ فلاں میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ میں نے یہ کہہ دیا اب اس پہ میرا کیا امپریشن بنے گا؟ اور اسے بیمار کرنے والے انسان کے پیرنٹس اور دوست ہوتے ہیں۔ ماں باپ پہ صرف اولاد کو کھلانے، اور پہنانے کی ذمہ داری نہیں ہے، صرف اسکے ظاہر کو تندرست رکھنے کا فرض نہیں ہے۔ گھر پہلی درسگاہ ہے اور اس درسگاہ کے معلم پہ فرض ہے کہ بچے کے دماغ کو بھی تندرست رکھے۔“ کاؤچ پہ بیٹھا آدمی اب سفید اون سرخ سویٹر میں شامل کر رہا تھا۔ ”دوست اور پیرنٹس اگر بات بات پہ ٹوکیں ناں، آگے بڑھنے دیں، ڈرائیں ناں تو انسان کا دماغ تندرست رہے گا۔ بچہ ابھی چند ماہ کا ہوتا ہے تب سے اسے بتایا جاتا ہے بلی آجائے گی، کتا آجائے گا، رات کا اندھیرا ہے، اندھیرا برا ہوتا ہے۔

یہ پرورش کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ ڈر، خوف کس چیز کا؟ اندھیرا ہے جیسے روشنی ہے۔ جانور ہیں جیسے انسان ہیں، خوف کس چیز کا؟ کسی کے گھر لے جاتے وقت کپڑوں کا دھیان رکھا جاتا ہے اگر یہی صفائی اسے اسکے گھر پہ سکھائی جائے تو بچہ بڑا ہو کر باہر نکلتے وقت یہ نہ سوچے پہننا کیا ہے۔ بولنے اور کھانے پہ ہزار تاکیدیں تب ہوتی ہیں جب باہر جانا ہو، کہیں دعوت ہو تب کیوں نہیں جب بچہ گھر میں ہے۔ یہ تھا تمہارے مسئلے کا ”کاز“ اسکی شروعات۔ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا؟“

”ایسا ہی تھا، ہر دوسرے بچے کے ساتھ یہی تو ہوتا ہے۔“ وہ ہلکی آواز میں بولی۔ مظفر نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔ اون کا گولہ ایک طرف رکھا۔ اور پوری طرح اسکی طرف متوجہ ہوا۔

”اپنی موجودگی کو کسی دوسرے کی موجودگی سے نہیں پہچانتے۔ اپنا حلیہ اپنا کھانا اور اپنا بولنا کسی دوسرے سے موازنہ نہیں کرتے۔ ایک تندرست دماغ ایسا نہیں کرتا۔ انسان کو یاد رکھنا ہوتا ہے وہ کون ہے۔ جانتی ہو انسان کیسے یاد رکھتا ہے وہ کون ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سیشن مکمل ہوا اب تم پندرہ دن تک یہ سوچو اس بیمار دماغ کو تندرستی کی طرف کیسے لانا ہے۔ پھر میں بتاؤں گا انسان کیسے یاد کرتا ہے وہ کون ہے۔“

کونج نے بے چاری شکل بنا کر اسے دیکھا مگر وہ مسکراتے ہوئے کال کاٹ گیا تھا۔ اس نے کہہ دیا اگلی بار تو پھر اگلی بار۔

کوئی اور تمہیں تمہاری شناخت نہیں کرواتا یہ تم ہار اپنا اسکل ہوتا ہے۔

ایک دہلی پتلی عورت نے اسے کوٹھڑی سے باہر نکالا۔ دوپٹہ سر پہ اچھی طرح جماتے خود کو ہر طرح سے چھپاتے وہ اسکے ساتھ چلنے لگی۔ ذہن میں بہت کچھ تھا جسے وہ جھٹک نہیں پار ہی تھی۔ بہت کچھ تھا جس سے وہ بھاگ نہیں سکتی تھی۔ تفسیشی کمرے میں لا کر جب اسے بٹھایا گیا تب اسکے سامنے ایک سیاہ وردی والا افسر تھا۔ مگر اگلے لمحے دروازہ دھکیل کر کوئی اندر داخل ہوا۔ ڈھیر ساری روشنی اسکے ساتھ ساتھ اندر آئی تھی۔ مگر وہ خود سیاہی میں ڈوبا تھا۔ اسکی آنکھیں، چہرہ قلق اور حزن میں مبتلا تھے۔ گردن اب بھی فخر سے اٹھی تھی۔ کونج مرعوب ہونے لگی۔ وہ آدمی، اسکا حلیہ، وہ انہی بلیسڈ لوگوں میں سے تھا۔ مگر پھر وہ دھندلا ہونے لگا اسکی جگہ کسی اور مرد نے لے لی۔

”مجھے پتہ چل گیا ہے بیمار دماغ کو تندرست کیسے کر سکتے ہیں۔“ لڑکی کی آواز سے ایکسائٹمنٹ جھلک رہی تھی۔

”اوکے بناؤ پھر کیسے کرتے ہیں؟“ کپڑے سے اپنا صوفہ جھاڑتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

کونج نے ایک دولمے لئے پھر کہنا شروع کیا۔ ”پیرنٹس نے جو کیا وہ صحیح غلط نہیں تھا۔ بس معاشرے کے اطوار تھے۔ لیکن وہ عادتیں راسخ ہو چکی ہیں ہم انہیں ایک دن میں نہیں نکال سکتے۔“ وہ بولتے بولتے رکی۔ اسے لگا مظفر اسکی بات دھیان سے نہیں سن رہا مگر...

”پھر انسان کو کیا کرنا چاہیے کونج حاکم؟“ وہ کرس پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اسے ڈھارس ملی۔

”انسان کو تبدیلی کا سفر شروع کرنا چاہیے۔ خود کو پہچانا چاہیے اور لوگوں سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ لوگوں سے بے نیاز کیسے ہوا جاتا ہے میں سیکھ گئی ہوں۔“

”حلائکہ تم یہ سب اپنی دادی سے سن کر آئی ہو۔“ میز سے کافی کا گگ اٹھاتے ہوئے مظفر نے چوٹ کی۔ کونج پہ مانو اس پڑ گئی۔ ”خیر کوئی بات نہیں میں بتاتا ہوں۔ اگلی بار تم کھوجنا کسی سے پوچھنا مت اوکے؟“ اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔ ”ہم لوگوں سے مرعوب اس لئے ہوتے ہیں کیونکہ ہمیں لگتا ہے وہ بلیسڈ ہیں، اور ہم نہیں۔ کیا ہے بلیسنگ؟ کپڑے، جوتے، مکان، لوگوں کا سوشل میڈیا؟ او نہوں۔ یہ ”ظاہر“ اندر کا حال آپ نہیں جانتے۔ مرعوب ہونے کے لئے اصل چیز ہے کسی کی خوش گفتاری، نرم مزاج، مہربان طبیعت، اپنی ذات پہ توجہ یہ چیزیں بس یہی خصوصیات ہیں جن سے مرعوب ہونا چاہیے۔ اور لوگوں سے بے نیاز کیسے ہوا جاتا ہے؟“

اس نے دیکھا کونج نے اسکے چند الفاظ نوٹ پیڈ پہ لکھے۔ وہ دنیا کی اس ریس میں دوڑنے کے لئے بہت محنت کر رہی تھی۔ مظفر کو اس پہ رشک آیا۔

”جب انسان کو اپنی worth پتہ چل جاتی ہے ناں تب وہ لوگوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کسی سیلیبرٹی کا کمٹ سیکشن دیکھا ہے؟ وہاں کئی لوگ ہیٹ کمٹ رتے ہیں۔ انہیں کوئی جواب نہیں ملتا اس لئے نہیں کہ سیلیبرٹی مصروف ہے۔ کمٹس ہر کوئی پڑھتا ہے لیکن وہ جواب نہیں دیتے کیونکہ انہیں معلوم ہے انہیں اگر ایک ناپسند کرتا ہے تو دس لوگ پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے انکی ورتھ۔ اور جو سیلیبرٹی جواب دیتے ہیں انکا دماغ تندرست نہیں ہوتا۔ انہیں دس میں سے دس کے دس لوگوں سے ستائش چاہیے یہ ناممکن ہے۔

کسی بھی محفل میں بات کرنے کے، پہننے اوڑھنے کے اور کھانے کے آداب آپ کو سیکھنے چاہیے لیکن کبھی بھی یہ مت سوچیں فلاں انسان میرے جانے کے بعد میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ اگر اپنی رائے دوں گا تو فلاں انسان مجھے کیسا سمجھے گا؟ رائے درست یا غلط نہیں ہوتی وہ بس خود کو محفل میں شامل کرنے کا خود کو آزاد ظاہر کرنے کا طریقہ ہے۔ لوگوں کی ظاہری مرعوبیت سے نکلنا ایک لمبا پراسیس ہے۔ ساری زندگی چلتا رہتا ہے۔ اب ہم اسے اگلے سیشن میں سیکھیں گے۔“ کال ایک بار پھر کٹ گئی تھی۔ کونج کے اندر ایک خلا رہ گیا جس کے لئے وہ اگلی کال کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے سب کچھ جلدی جلدی جاننا تھا۔

اس نے بلب بند کر دیا۔ وہ شاید اس بچی کو ٹارچر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے نرم نگاہوں سے تک رہا تھا۔ کونج نے ایک لمحے کے لئے بھی اسکے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ اسکا لباس، خوشبو، جوتے، پیسہ اگر سب چھین لو تو مرعوب کرنے کے لئے کیا تھا؟ وہ بس یہی سوچ رہی تھی اگر یہ شخص کوئی مڈل کلاس مرد ہوتا برانڈڈ کی جگہ اس نے ایک عام لباس پہنا ہوتا مشہور کی جگہ وہ غیر معروف ہوتا تب کیا تھا وہ؟ خاک بھی نہیں۔

”تمہیں یہاں لانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ جگہ تمہارے لئے نہیں ہے بچے۔ لیکن میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ کرسی اٹھا کر اسکے قریب لایا۔ ہاتھ بڑھا کر نہایت نرمی اور شفقت سے اسکے سر پہ رکھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

اسکے اندر کی پیپل پلیزر، پیس میکر بچی اسے جواب دینا چاہتی تھی کچھ ایسا جو اسے کونج کے خلاف نہ کرے۔ وہ بس اسے برانہ سمجھے مگر . . . اگر وہ ناراض ہو گیا تو؟ اگر اس نے غصہ کر دیا تو یہ سب لوگ سنیں گے لوگ کونج کو کیا سمجھیں گے؟

”مجھے نہیں پتہ، لیکن اگر پتہ ہوتا تب بھی میں تمہیں نہ بتاتی۔“ اپنا ہر خوف جھٹک کر ہر قسم کی مرعوبیت دفعان کر کے اس نے قیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیونکہ کسی نے اسے سمجھایا تھا انسانوں سے بے نیاز کیسے ہوا جاتا ہے۔ اور وہ سمجھ بھی گئی تھی۔

”دادی . . . ایک بات بتائیں۔“ پلنگ پہ پیرپسارے بیٹھی عورت کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک انسان دوسرے انسان سے بے نیاز کیسے ہوتا ہے۔؟“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

دادی نے سوچنے کے لئے چند لمحے لئے۔ کچھ ایسے الفاظ جو اسکی سمجھ آ سکیں۔

”جب وہ درخت جتنا مضبوط بنتا ہے۔“ کافی دیر بعد وہ دھیرے سے بولیں۔

”درخت جتنا مضبوط؟ کوئی انسان درخت جیسا مضبوط کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بد مزہ ہوئی۔

”جب وہ اپنی جڑوں پہ انحصار کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ جڑیں جو اسے پانی کھینچ کر لا کر دیں گی اور وہ پھلے گا، پھولے گا۔ حسین ہو گا کسی کے کام آئے گا۔ انسان کی جڑ جانتی ہو کیا ہوتی ہے؟“ کونج نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مومن کی جڑ اسکا دین ہے۔ چودہ سو سال پہلے اصول و ضوابط بن گئے تھے۔ بتایا گیا تھا تم نے

آگے جا کر محمد مصطفیٰ کی پیروی کرنی ہے۔ جو مومن جڑیں چھوڑ دیتا ہے وہ بری طرح زمین بوس ہوتا ہے۔ اور تم نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا کوئی درخت آگے بڑھ آئے اور گرے ہوئے درخت کو کھڑا کرے۔ اور یہاں اس درخت کو دوبارہ اپنی جڑوں پہ انحصار کرنا ہوتا ہے وہی جڑیں اسے دوبارہ نئے سرے سے نیا درخت بنائیں گی۔ جڑیں بھول جانے والا، ان سے غافل ہونے والا انسان خسارے میں ہے۔ ”کونج چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ کہنے کو، پوچھنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

”درخت کو معلوم ہوتا ہے اس نے پانی خود لانا ہے، ہوا اسے خود لینا ہے، لمبا اور تنہا اور اپنے دم پہ ہونا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کو یہ یقین آجائے کہ کوئی دوسرا انسان اسے کچھ نہیں دے سکتا۔ نہ رزق، نہ روٹی، نہ عزت نہ دولت۔ انسانوں کا خوف ہم سے کچھ ایسے کام کرواتا ہے کہ ہم گردن نہیں اٹھا سکتے مگر جس دن انسان یہ سوچنے لگے کہ یہ مہنگے لباس اور مختلف چمڑی والے لوگ اس لباس اور روپے پیسے کے بغیر بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ وہ جو خود کو مرنے سے نہیں بچا سکتا وہ کسی کو کیا دے گا؟“

”میں تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دونوں جانتے ہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ قیس وہیں میز کے ساتھ کمر جوڑے کھڑا ہوا۔ ”پولیس تمہارے ساتھ سختی کرے گی۔ اور شاید وہ سلوک بھی جو تمہاری بہن کے ساتھ ہوا۔ لیکن اگر تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اسے محفوظ کرنے کے لئے تمہارے بھائی اور منگیتر نے کس انسان پہ بھروسہ کیا ہے تو میں اپنی شکایت واپس لے لوں گا۔“ کونج کے دل میں جھکڑ چلنے لگے۔ وہ اسے ناں بولے؟ کیا وہ یونہی اپنی بات پہ ڈٹی رہے؟ لیکن اگر اسے غصہ آگیا تو؟ وہ کونج کیا بارے میں کیا سوچے گا؟

”تمہاری بہن نے تمہاری پرواہ نہیں کی تھی۔ اس نے وہ کیا جو وہ چاہتی تھی وہ خود غرض تھی تم اسکے بارے میں مت سوچو۔ صرف اپنا سوچو ہر انسان اپنا سوچتا ہے۔ کوئی دوسرا انسان تمہیں کیا دے سکتا ہے؟“ رفتہ رفتہ اسکی آواز غائب ہونے لگی اور بس اسکے ہونٹ ہلتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ پھر وہ بے آواز ہو گیا۔

”گرے ہوئے درخت کو کوئی نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ وہ خود اپنی جڑوں کے پاس لوٹ جائے یہی اصول انسانوں پہ لاگو ہوتا ہے پھر کیا فائدہ انسانوں کے پاس جانے کا؟“ کافی دیر بعد وہ نروٹھے پن سے بولی۔ دادی مسکرائیں۔ اس نسل کو بس حالات کا منفی رخ ہی کیوں دیکھنا تھا؟

”جو اپنی جڑوں سے وفادار نہیں ہوتا ناں کوئی اس سے وفادار نہیں رہتا۔ اور ساتھ کھڑے لوگ خوبصورتی دیتے ہیں، ساتھ دیتے ہیں۔ ایک اکیلا درخت کبھی خوبصورت نہیں لگتا اسکے ساتھ کھڑے درخت اسکی شان میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے کتنے لوگ بیٹھ سکتے ہیں، کتنی چھاؤں دی جاسکتی ہے؟ دس درخت ہوں گے تو بوجھ بٹے گا۔ چھاؤں بڑھے گی۔ اسی طرح ہمارے قریبی انسان اگر کچھ دکھاتے نہیں اسکا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے کوشش نہیں کی ہوگی۔ کبھی تو بوجھ بانٹا ہوگا، کبھی تو خود پہ ضرب کھا کر ٹہنی کسی کو دی ہوگی، کبھی تو چڑیوں کے شور سے نجات پانے کو اپنا سینہ کشادہ کر کے نئے گھونسلے بنوائے ہوں گے اور اگر انہوں نے یہ نہیں بھی کیا تو انسان اپنی جڑ یاد رکھے۔ نبی کریم نے ہمیشہ انسانیت اور بھلائی کے لئے پہل کی تھی۔ انسان دوسروں سے بہت امیدیں رکھتا ہے مگر اپنی طرف سے کسی کو کچھ دینا پڑے، تو تھک جاتا ہے۔“ آخر میں بے لاگ تبصرہ کیا۔ کونج کافی دیر تک انہیں سوچتی رہی۔

وہ اب کونج کے سامنے بیٹھ رہا تھا۔ نگاہیں نرم ہی رہیں۔ ”تم ایک خود غرض عورت کے لئے اپنی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہو گی ہے ناں؟“

”وہ میری بہن ہے۔ اس وقت کہاں ہے مجھ نہیں پتہ۔“ تمام تر ہمت مستحجم کرتے، اس نے کہہ ڈالا۔ ”لیکن اگر مجھے پتہ ہوتا میں تب بھی تمہیں کچھ نہ بتاتی۔“ دہرایا۔ ”اگر اس نے میرے لئے کچھ نہیں کیا تو تم غلط ہو۔ اسکا ساتھ ہونا بھی طاقت ہے اور تم مجھے توڑ نہیں سکتے۔“ اسکی آنکھیں جانے کیوں بہہ رہی تھیں، ہاتھ اور جسم جانے کیوں کپکپا رہے تھے اسے کچھ علم نہیں تھا۔ ”تم مجھے نہیں توڑ سکتے، میری جڑیں مضبوط ہیں عبداللہ زمان۔ تم مجھ سے کچھ نہیں اگلو سکتے کیونکہ اب میں تم سے نہیں ڈرتی۔“ اسکی گیلی آنکھیں، اسکے لرزتے وجود کو دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چند پل اسے دیکھتا رہا پھر افسر کو اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

کیا ہوا اگر وہ کم عمر تھی، کمسن تھی یا پھر کمزور تھی، وہ بس ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے قیس کو اسکی محفوظ پناہ گاہ سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انجام وہی تھا جو باقی سب کا ہونا تھا۔ اسے جاتے ہوئے تاسف ہوا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

رنگ، روشنی، لوگ، دنیا، عمارتیں ہر شے چھوڑ کر چپکے سے دبے پاؤں کہانی کے دوسرے رخ کی طرف آؤ تو وہ چھوٹا سا قید خانہ ویسا ہی خاموش اور تنہا تھا۔ مہدی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سبز آنکھیں ویران تھیں۔ اسے کئی بار شدید درد ہونے لگتا تھا اور کئی بار وہ بس خالی خالی نگاہیں لئے آس پاس تکتا رہتا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو وہ یاد آ جاتی تھی، وہی جس کی آنکھیں سنہری تھیں۔ مہدی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک بار پھر یاد آنے لگی۔ بس اسکی یاد تھی جو اس زندان میں ایک اسکی امید بن گئی تھی۔

سفید رنگ چھٹ گیا۔ اسلام آباد کے کسی رنگین فارم ہاؤس نے اسکی جگہ لے لی۔ جہاں گھاس کے وسیع و عریض قطعے پہ ہلکے آسمانی اور سفید رنگ کا ڈیکور تھا۔ پھول، غبارے، برقی قمقمے، اور مستطیل میزیں جن پہ انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ یہ عمارت کافی اونچائی پہ واقع تھی اس لئے یہاں سے ایک خوبصورت سن سیٹ اور شہر کے نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ شیشے کی گرل پہ ہاتھ جمائے گردن میں کیمرہ لٹکائے، وہ دور شہر کو تک رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے کامدار لگھے میں اسکا اونچا سر اپا نمایاں تھا۔ دفعتاً کوئی اسکے عقب میں آکر کھڑا ہوا۔ زینیا نے مڑ کر دیکھا۔ سفید رنگ کے تھری پیس میں مہدی اسکے سامنے کھڑا تھا۔ اسکی انگلیوں کے درمیان سیگریٹ دبا تھا۔ جسے اب وہ ہاتھ سے پشت پہ لے گیا تھا۔

”انسان کو وہ کام نہیں کرنا چاہیے جسے چار لوگوں کے درمیان نہ کیا جاسکے۔“ بلا ارادہ اسے ٹوک دیا۔ سیگریٹ سے اسے بے تحاشا نفرت رہی تھی۔ گو کہ مہدی ہمیشہ اسے یا پھر اپنی رپورٹ کسی بھی فی میل دوست کے سامنے سیگریٹ نہیں پیتا تھا۔

”عادت ہے، جلدی نہیں نکلتیں۔“ ڈھلتے سورج کی روشنی ان دونوں کے چہرے کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ”یہ بتاؤ یہاں کیسے؟“

”شینزل کی ایک دوست کو یہاں فوٹو گرافی کرنی تھی۔ اسکے ساتھ آئی ہوں۔ (قیسم سے معاہدے سے چند دن قبل کا ذکر ہے)“ وہ اسکی طرف پشت کئے کھڑی ہو گئی تھی۔

”وہ بکواس کر رہا تھا۔“ مہدی نے سیگریٹ نیچے چھینک کر اسے بوٹ سے مسلتے ہوئے کہا۔ زینیا کی آنکھیں اچھنبے سے چھوٹی ہوئیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ”وہ پامسٹ بکواس کر رہا تھا۔“ اب اس نے واضح لفظوں میں اپنی بات دہرائی۔ وہ اس وقت تقریب میں موجود نہیں تھا، شاید اس نے آتے ہوئے یہ بات سنی ہو۔

چند منٹ وقت میں پیچھے سفر کرو تو گھاس کے اس وسیع قطعے پہ جہاں اس وقت کھانا ہاتھوں میں لئے مہمان یہاں سے وہاں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے وہیں ایک طرف لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔ اور بچے میں ایک مختلف حلیے والا لڑکا کسی لڑکی کے ہاتھ پڑھ رہا تھا۔ پھر کوئی تبصرہ کیا تو اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے اگلا ہاتھ شیزل کا پڑھا تھا۔ وہ جو اپنے دوستوں کے درمیان گھر کر بیٹھی اس نئے شوشے کو انجوائے کر رہی تھی اس نے پلٹ کر زینیا کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلا یا زینیا نے منع کر دیا تو وہ اٹھ کر اسکے قریب آئی۔

”یار دو منٹ کا کام ہے ہم نے کونسا یقین کر لینا ہے اسکی بات کا صرف سنیں گے اور بس۔“ وہ انکار کرتی رہ گئی مگر شیزل اسے کھینچ کر لے آئی۔ اپنے برابر اسکی جگہ بنائی اور اسکا ہاتھ پڑھنے کو کہا۔ لڑکے نے ہاتھ پڑھنے کے لئے اسکے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا مگر وہ پہلے ہی ہاتھ پرے کر گئی۔ ”یہیں سے پڑھیں۔“

”یہاں سے قسمت خراب دکھائی دے رہی ہوگی۔“ لڑکوں میں سے کسی نے لقمہ دیا۔ جسے شیزل نے مڑ کر دیکھا۔

”بلکل تمہاری شکل کی طرح؟“ اسکے برجستہ جواب پہ باقی سب سمیت زینیا بھی ہلکا سا مسکرائی۔ شیزل نے زینیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے آگے کیا اور اب ریان نامی وہ پامسٹ اسکا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے اس ہجوم میں کوئی آکر کھڑا ہوا۔ یہاں سے اسے زینیا کی پشت نظر آتی تھی۔ ریان نے اسکے ہاتھ کی لکیریں پڑھیں پھر اسے دیکھا۔

It's scary اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ ”تم سے گھر چھوٹے گا، شوہر بھی اور مقام بھی۔“ وہ کہنا چاہتا تھا عزت بھی مگر کہہ نہیں سکا۔ ”یہ اٹل ہے۔“ اس نے اضافہ کیا۔

زینیا کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں آیا۔ اس نے جس طرح ہاتھ آگے کیا تھا اسی طرح واپس بھی کھینچ لیا۔ ماحول میں یکدم تناؤ بڑھ گیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کسی کی طرف دیکھے آگے بڑھ گئی۔ اس نے مہدی کو نہیں دیکھا تھا۔ شیزل اسکے ساتھ چلتے ہوئے اسے کچھ سمجھاتی رہی زینیا محض سر ہلاتی رہی تھی۔ اسکے دماغ سے چیزیں جلدی نہیں نکلا کرتی تھیں۔

”کیا پتہ سچ کہہ رہا ہو۔“ سیاہ لباس والی لڑکی نے کندھے اچکائے۔

”تمہارا شوہر تو میں ہوں۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں؟؟“

”اس نے کہا تھا ”چھوٹ“ جائے گا۔ لفظوں پہ غور کیا کریں مسٹر کمبیر۔“

”میں کہہ رہا ہوں ناں وہ بکواس کر رہا تھا۔“ زینیا کو نہ جانے کیوں اسکا لہجہ تھوڑا سخت لگا۔ اور مہدی کو اسکے چہرے پہ ادا سی سخت کھلی۔ ”اور اگر ایسا کچھ ہے تو میں بدل دوں گا۔ تم سے کچھ نہیں چھوٹے گا۔ نہ نام، نہ مقام، نہ شہر، نہ گھر۔ قسمت دعاؤں اور کوششوں سے بدلتی ہے میں دونوں طریقے استعمال کر کے اسے بدل دوں گا۔ باقی سب چھوٹ گیا تو میں شاید کچھ نہ کر سکوں لیکن تم سے شوہر نہیں چھوٹے گا۔“ دھوپ اب دم توڑنے لگی تھی۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں یہاں تک آرہی تھیں۔ ان سب کے بیچ وہ کہہ رہا تھا۔

”اور اگر چھوٹ گیا تو . . .“

”تو میں واپس لے آؤں گی۔“ زینیا نے اسکی بات درمیان میں کاٹی۔ ”ایسے نجومی میں بیچ کر کھا سکتی ہوں۔ میرا گھر، مقام، سب واپس لاسکتی ہوں“ اس نے کندھے سے بیگ اتارا اور کیمرہ نکالا۔

اور شوہر؟“ وہ مسکراہٹ دبائے ہوئے پوچھ تھا۔ زینیا نے آنکھیں گھمائیں۔

”ذرا اپنا موبائل بھی نکال لو۔ اور مجھ بے قصور کو بلاک لسٹ سے نکال دو۔“

وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ ہلکا سا مسکرائی۔ ”آپ نے میرے آرٹ کے متعلق جو کمنٹس دیئے تھے اس پہ یہی بنتا تھا۔“

”یار میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس بلیک اینڈ وائٹ تھیم کو ہٹا کر کچھ رنگین کرو۔ دنیا میں کتنے سارے رنگ ہیں اور تم دورنگ استعمال کرتی ہو۔ میں تو جس دن سات سے آٹھ رنگ نہ دیکھوں میرا دن ہی نہیں گزرتا۔ رنگ، لوگ، باتیں کوئی انسان اس سب کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟“ اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ زینیا جواب میں کچھ کہہ رہی تھی، مہدی ناک سکوڑے سناتا رہا۔ رنگ رخصت ہوئے، قہقہے دم توڑ گئے اور ویرانی ایک بار پھر غالب آئی۔

یہاں وہ کمر دیوار سے لگائے تنہا اور خالی ہاتھ تھا۔ سوچیں کسی سے شروع ہوتی تھیں تو وہ زینیا تھی اور جہاں آکر ختم ہوتی تھیں وہ بھی زینیا حاکم ہی تھی۔ اس سفیدی سے تنگ آکر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی پل دروازہ کھلا، مہدی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اس وقت کم از زر قون کی شکل تو بالکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر وہاں صرف زر قون نہیں تھا۔ آج تین سے چار لوگ ہاتھوں میں مختلف چیزیں لئے اندر داخل ہوئے۔

دیوار کے ساتھ ایک سفید سکرین لگائی گئی۔ ایک طرف سفید اسٹول پہ سفید ہی رنگ کا پرو جیکٹر رکھا گیا۔ آنے والے تمام لوگوں کے لباس بھی سفید ہی تھے۔ زر قون کے ہاتھوں میں پاپ کارن کے دو پیکٹ تھے۔ اس نے باقی سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود مہدی کے ساتھ جڑ کر بیٹھا۔ ایک پیکٹ اسکی گود

میں رکھا اور دوسرا اپنے پاس۔ پروجیکٹر کی روشنی سفید پردے پہ پڑی تو وہاں بے رنگ منظر چل پڑا۔ مہدی دم سادھ گیا۔

”میں نے سوچا تمہیں بتاؤں گا تو تم یقین کرو گے، یا نہیں لیکن اگر تمہیں دکھایا جائے تو ظاہر ہے تم یقین کرو گے۔“ وہ بڑے ہی مزے سے کہتے ہوئے پاپ کارن منہ میں ڈال گیا۔ مہدی بدستور پردے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ہر شے بے رنگ تھی۔ وہ بالکنی میں کھڑا تھا اسنے موبائل کان سے لگا رکھا تھا۔ اسی لمحے گولی چلی اور مہدی کے سینے میں آکر پیوست ہوئی، اسکے جسم کو دھکا لگا اسی پل میں دو اور گولیاں چلیں اور اسکے جسم میں سوراخ ہوئے۔ مہدی کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے تک گیا تھا۔ تو یہ درد وہی تھا؟

”نائنس شاٹ۔“ زر قون نے تین انگلیاں ہتھیلی پہ مارتے ہوئے گویا تالی بجائی ہو۔

اگلے منظر میں اس نے زینیا کو آگ لگی عمارت کے اندر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مہدی کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اسکے بس میں ہوتا وہ وقت کو پیچھے لے کر جاتا، بس ایک بار اس سے کہہ پاتا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”کہنا پڑے گا لڑکی ہے بہادر۔ کہاں سے ملی؟“ اس نے گردن پھیر کر مہدی کو دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔ مہدی نے اسے نہیں دیکھا وہ سکرین دیکھ رہا تھا جہاں ریسکیو ٹیم کے دو مرد زینیا کو باہر لا رہے تھے۔ اسکے بازو پہ کوئی زخم تھا، اسکا لباس جل گیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں جلن اتر رہی تھی۔ مہدی کو یوں لگا جیسے اسکے جسم پہ چیونٹیاں رہینگ گئی ہوں۔ میرہ نے اسے تھپڑ مارا۔ اسکے ہاتھ کی مٹھی بھیج گئی۔ وہ روتے ہوئے ایک ایک کو مہدی کے زندہ ہونے کا یقین دلارہی تھی اور یہاں اسے، اسکی محبت، اسکی

دیری دیکھ مہدی کی آنکھوں میں پانی کے قطرے جمع ہوئے۔ کئی بار انسان کی اپنی تکلیفیں بے حد ثنائی رہ جاتی ہیں۔

اگلا منظر جان لیوا تھا۔ قیس کمبیر نے اسکے گلے پہ اپنے دونوں ہاتھ جمائے مہدی کمبیر کے لئے یہ لمحہ نری موت تھا۔ ساری دنیا آگ بن گئی پھر راکھ اور پھر دھتکتے کوئلے، ایسے کوئلے جنہیں مہدی کے دل پہ مسلا گیا تھا۔ اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف کیا ہو سکتی تھی کوئی اسکی بیوی پہ بھری محفل میں اس پہ ہاتھ اٹھا سکتا تھا؟ کیا وہ اتنا کمزور تھا کہ اپنی عورت کی حفاظت نہیں کر پایا۔ وہ سارا کا سارا خاکستر ہوا۔

اسکے بعد تو وہ جیسے سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ ”میں قیس زمان کمبیر، مہدی کمبیر کے لیگل گارجین کے طور پہ زمینیا حاکم کو اپنے بھائی کے قتل کے الزام میں نامزد کرتا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور مہدی سن ہو رہا تھا۔ ساکت، شل۔ کونسا تعلق کہاں آکر ٹوٹ رہا تھا۔ کون سے چہرے کہاں آکر کسی جانور کا روپ دھار رہے تھے؟

پولیس افسران کے نرغے میں وہ کیمبرہ اور فلیشز کے درمیان تھی۔ سوشل میڈیا پہ کئے ہوئے کمینٹس کی جھلکیاں سامنے آئیں، لوگوں کی زہرا گنتی زبان، زمینیا کی وہ ناقابل بیان حالت مہدی کمبیر کو اپنی زندگی میں کبھی سی چیز نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا سکرین پہ گزرتے، آگے بڑھتے، چلتے بدلتے منظر کر رہے تھے۔ اسکی روح تک متاثر ہو رہی تھی۔

اگلے منظر ٹکڑوں میں تقسیم شدہ تھے۔ وہ عدالت کی راہداریوں میں تھی۔ وہ کیمبرہ کے سامنے تھی، کبھی وہ پولیس کی گاڑی میں تھی۔ اس کے سر سے دوپٹہ سرکا، چہرہ واضح ہوا وہاں زخم تھے۔ ویسا ہر زخم اسے اپنے دل پہ نقش ہوتا محسوس ہوا۔ اگلے منظر میں وہ پولیس کی تحویل سے غائب ہو گئی تھی۔ مہدی بے اختیار

آگے ہوا۔ یوں جیسے اب کچھ اچھا ہونے والا ہو گا۔ مگر نہیں اگلے منظر میں پولیس اسکے قتل ہو جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ غیرت کے نام پہ قتل۔ سبز آنکھیں جامد ہو گئیں۔ ہر حرکت، ہر گردش تھم گئی۔ کسی نے مہدی کے سینے سے دل نکال کر اسے روند دیا تھا۔ اور یہاں سکرین ایک بار پھر سفید ہوئی۔ مہدی نے تیزی سے گردن موڑ کر زر قون کو دیکھا۔

”مجھے دیکھنے دو اب کہاں ہے وہ؟ بند کیوں کیا ہے اسے واپس چلاؤ۔“ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ”یہ سب کس نے کیا ہے؟ میری بیوی کو کیسے فریم کر سکتے ہو تم لوگ؟ چلاؤ اسکو وہ کہاں ہے مجھے بتاؤ۔“ گھٹنوں کے بل اٹھ کر اس نے زر قون کے گریبان پکڑنے چاہے مگر وہ اسکے چہرے پہ تھپڑ مارتے ہوئے اسے دور ہٹا گیا تھا۔ مہدی گرا، اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اس بار زر قون نے اسکی پسلیوں میں ضرب دے ماری یہ وار کاری تھا۔ ایک لمحے کے اسکی ساری دنیا تھم گئی۔ آوازیں، منظر، گردش سب تھم گیا۔ زر قون اسے گالیاں بک رہا تھا مہدی نہیں سن پا رہا تھا، اس نے اپنے سینے میں آگ لگتے ہوئے محسوس کی۔ اسکے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور دماغ میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ ضرب نے واقعی سزا دی تھی۔ اسکی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

”اگر دوبارہ تم نے مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا مہدی کمبیر۔“ وہ نیچے جھک کر اسکے جبرے کو ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ سفید کمرے، یہاں بہت جلد تم سیکوئینس کھو دو گے، قوت ارادی کھو دو گے، وقت کا حساب بھی، پھر تمہیں انگڑائی ہو گی، اسکے بعد تم ہلوسینیٹ کرو گے، پھر اپنی یاد داشت کھونے لگو گے یہ جگہ یہاں تم پاگل ہو جاؤ گے اور تم یہی ڈیزرو کرتے ہو۔ تمہاری بیوی اب تک تو کہیں غرق ہو چکی ہو گی اسکا انتظار اور یہاں سے نکلنے کی امید چھوڑ دو۔“ بوٹ سے اسے ٹھوکر مارتے وہ کمرہ چھوڑ گیا تھا۔ مہدی بند ہوتی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کیا وہ واقعی بھول جائے گا وہ کون ہے۔ کیا وہ واقعی امید چھوڑ دے زینیا حاکم سے دوبارہ تعلقات ہوں گے؟

”ایک وقت میں انسان جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوتا ہے، اسے علم نہیں ہوتا وہ کبھی انہی چیزوں کے مل جانے پہ ناخوش ہو گا۔“

وہ کتنی ہی دیر سے کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں۔ مگر سرخ۔ چہرے کے زخم واضح تھے، پیٹھ کی جلن الامان۔ جو اس نے چاہا تھا وہ تو ”زندگی“ تھی جو اسکے پاس تھی۔ مگر جو چھوٹا تھا وہ اسکی بھرپائی کہاں سے کرتی؟ سب کھوٹا ہو گیا تھا۔ یہ سب اسے بے سانس کر رہا تھا۔

کھڑے کھڑے اسکی ٹانگیں شل ہونے لگیں تھیں مگر وہ کھڑکی سے ہٹی نہیں۔ کبھی ٹھیلے والوں کو دیکھتی جو نافہم زبان میں صدائیں لگا رہے تھے۔ عورتیں زیادہ تر عبایا اور حجاب میں ملبوس تھیں۔ کچھ ساڑھیاں پہنے ہوئے ٹھیلوں کے قریب آکر رکتیں سبزی خریدتیں پھر آگے بڑھ جاتیں۔ کچھ اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑ کر اسکول سے واپس گھر لارہی تھیں۔

مرد آفس سے لوٹ رہے تھے، کچھ اپنے کسی کام کو جا رہے تھے۔ گاڑیاں، بانیکس، تانگے مین روڈ پہ زندگی بھاگ رہی تھی۔ ڈھاکہ آبادی میں ایک بڑا ہندسہ رکھتا ہے۔ اور اس کھڑکی میں کھڑے ہوئے شور، رش اور لوگوں کی بہتات دیکھ زینیا اس بات پہ یقین بھی کر چکی تھی۔ لوگوں کے چہرے، مسکراہٹیں، ماحول سب اپنا اپنا تھا پھر بھی سب غیر کیوں تھا؟ اسکے سارے وجود میں ایسی بے چینی تھی جسے وہ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ کمرے میں رکھے اس واحد بیڈ کی طرف آئی۔ ”سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے زینیا۔“ سرگوشی کرتے ہوئے اس نے خود کو باور کروایا۔ ”تم اس عورت کی موت کی ذمہ دار ہو جس نے تمہیں ماؤں کی طرح پالا۔ تم ذمہ دار ہو سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ مہدی تمہاری وجہ سے تکلیف میں ہے، کونج، بشر، اباسب تمہاری وجہ سے سفر کر رہے ہیں تم وجہ ہو صرف تم۔۔۔۔“

اس نے خود کو باور کروایا۔ وہ جو کئی دن سے ڈٹ کر کھڑی تھی رفتہ رفتہ ڈھے گئی۔ اسے اسکے جسم کی ساری توانائی ایک ہی لمحے میں سلب ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔ ارادی یا غیر ارادی طور پر وہ ہر اس شے کا الزام لے گئی تھی جو اس نے کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔ زندگی اب وہ اپنے آپ پہ خود حرام کرنے والی تھی۔ کیونکہ وہ یہی ڈیزرو کرتی تھی۔

”انسان چاہے جتنا مرضی ”اکیلے“ ہونے کا راگ الاپتا رہے۔ خود کو عقل کل سمجھ لے، اپنی طاقت پہ رشک کر لے اسے ہر دور میں ”انسانوں“ کی ضرورت رہتی ہے۔ جسمانی تکلیف وہ تکلیف ہے جس کے آگے بڑے بڑے سوراخ ہمارے جاتے ہیں۔“

وہ ساری رات خوف اور حفاظت کے زیر اثر جاگتی رہی تھی۔ زینیا حاکم اس ایک زندگی میں مرنا پسند کرتی مگر کسی پہ بھروسہ کرنا نہیں۔ یہ بن باس شاید ختم ہو جاتا، یہ تکالیف مٹ جاتیں، وقت کبھی مرہم بن جاتا مگر وہ کبھی پہلے جیسی نہیں بن سکتی تھی۔ طوفان آتے ہیں، سب بہا کر چلے جاتے ہیں آثار مگر رہ جاتے ہیں۔ رات کا جانے کو نسا پہر تھا جب اسکی آنکھ لگ گئی۔ جب اسکی آنکھ دوبارہ کھلی اسے اپنے بستر اور بازو چپچپا محسوس ہوا۔ درد کی لہر اسکی ریڑھ کی ہڈی اور بازو میں محسوس ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر خالی معدہ اسکا دماغ چکرائے دیتا تھا۔ کئی لمحے اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا رہا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر منظر واضح کرنا چاہا۔

اس نے بازو پہ ہاتھ رکھا وہ گیلا اور چیچھا تھا۔ وہ بامشکل اٹھ بیٹھی۔ آنسو درد کے مارے کب نکلے تھے اسے کوئی علم نہیں ہو سکا۔ وہ بس بازو لٹکائے زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ درد ختم ہو جانے کی بجائے بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس نے سائیڈ دراز پہ ہاتھ مارا تو لیمپ روشن ہوا۔ زرد روشنی میں جب اس نے اپنے بستر پہ نگاہ ڈالی تو اگلی سانس نہیں لے سکی۔ اسکا بستر، اسکی سفید چادر خون سے بھری ہوئی تھی اور اسکے بازو سے اب تک بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

زینیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹہ اٹھا کر بازو پہ باندھنے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ تک خون سے رنگ گئے۔ اس نے سر پیچھے گرد دیا لمبے گہرے سانس لئے۔ زخم کھل گیا تھا۔ اور تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس نے انگلیوں کے پوروں سے چھو کر دیکھا زخم کے گرد سوزش تھی، اور ایک اور زخم۔ شاید سمندر کی آب و ہوا، اسے اس نہیں آئی تھی۔ ”کوئی ہے؟“ ... ”زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو مدد کے لئے پکارا تھا۔“ ... ”نیا ... نیا ... کوئی ہے؟“ ہیلپ می پلیز۔ ”سسکیاں دباتے درد سے تڑپتے اسکے لبوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ مگر جواب نہ در۔ زینیا نے دانت پہ دانت جمائے، اٹھ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑا گلاس ہاتھ میں لیا اور پوری قوت سے دروازے پہ دے مارا۔ خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا اور بس یہاں، اسی لمحے وہ گر پڑی۔ زمین پہ ہاتھ مارتے ہوئے وہ بہت مشکل سے درد برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند لمحوں بعد نیا اندر آتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ مار کر بتیاں جلائیں تو سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ اس نے بیڈ کی طرف دیکھا وہاں خون تھا۔ فرش، اور زینیا کے بازو پہ بھی خون تھا۔ عورت کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں آیا وہ پلٹ گئی۔ چند پل بعد واپس آئی تو اسکے ساتھ وحید بھی تھے۔ وہ زینیا کے پاس آکر بیٹھی قینچی سے اسکا بازو پھاڑا، زخم بری طرح کھل گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں زینیا کو بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ پہ لٹایا وہ مسلسل

درد سے چلاتی رہی اور نیا چپ چاپ اسکے بازو کے زخم صاف کرتی رہی۔ وہ جس نے ہمیشہ سوچا تھا اسے انسانوں کی ضرورت نہیں اسے ضرورت پڑ گئی تھی۔

”فکر مت کریں بچے، نیا جی نرس ہیں۔ آپ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا۔“ وحید نے اسے تسلی دی۔ کوئی تسلی اثر نہیں رکھتی تھی درد ہر لفاظی پہ بھاری تھا۔ چند پل بعد وہ اسکی پٹی کر چکی تھیں۔ اس سارے وقت میں زینیا کسی دو سالہ بچے کی طرح روتی رہی تھی۔ ”کروٹ کے بل سونے کی کوشش بھی مت کرنا، زخم بہت بری طرح خراب ہو چکا ہے اور“ انہوں نے وحید کو دیکھا پھر زینیا کو جس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں۔ ”جہاں تک مجھے لگتا ہے یہ بازو دوبارہ پہلے جیسا نہیں ہو سکے گا۔“

سنہری آنکھوں والی لڑکی کو شاک لگنا تھا تو نہیں لگا، رونا تھا تو وہ نہیں روئی۔ یہ ہر اس شے کی قبولیت تھی۔ اسے سب قبول تھا کیونکہ وہ یہی ڈیزرو کرتی تھی۔ یہ درد، یہ تکلیف اور یہ لمبی سزا یہ اسکا مقدر تھی۔

”لوگ کہتے ہیں انسان کو امید نہیں رکھنی چاہیے، انسان کو لوگوں سے روابط کم رکھنے چاہئیں، انسان کو یوں کر ناپا چاہیے یوں نہیں لیکن ایک وقت آتا ہے جب انسان سب بھول جاتا ہے وہ زندگی کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔“

تین کمروں پہ مشتمل اس پورشن میں بہت شور تھا یہ اسے تب معلوم ہوا جب نیا کی بھابی میکے سے واپس آگئی۔ اسکے تین بچے تھے۔ انہوں وہ شور ان تین بچوں کا کبھی نہیں ہوا تھا یہ شور نیا کی بھابی وجیہہ کا تھا جسے ہر شے پہ اعتراض ہوا کرتا تھا۔ اس وقت بھی گھر میں شور تھا کیونکہ وجیہہ کو اسکی پسند کی مچھلی فرائے نہیں ملی تھی۔ وہ عورت ہر شے میں کیڑے نکالنا جانتی تھی۔

”میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ کل سے دوبارہ ہسپتال جاؤں گی۔ تمہارے لئے وہاں بات کروں گی۔“ کھانے کی پلیٹ سے سبزی کا نوالہ بناتے ہوئے نیمانے اسے اطلاع دی۔ زینیا چپ چاپ دیوار کو دیکھتی رہی۔ یہاں کا کھانا بہت مختلف تھا اسے اس کھانے سے بالکل بھی اپنائیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”تمہارے لئے سوائپر کا کام مل جائے گا یا پھر“

”میں زینیا حاکم ہوں۔ میں تمہیں سوائپر لگتی ہوں؟“ اس نے گردن ترچھی کر کے اسے یوں دیکھا جیسے اسکا مذاق اڑا رہی ہو۔ گردن اب بھی اکڑی ہوئی تھی۔ ”میں اپنے ملک واپس جاؤں گی۔ میں تم سب کو جا کر دکھاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن جب تک تم اس ملک میں میرے گھر پہ ہو مجھے کما کر لا کر دو گی۔ کیونکہ پچھلے بیس دنوں سے تم پہ دس ہزار ٹکے (ٹکا بنگالی کرنسی کو کہتے ہیں) لگ چکے ہیں۔ اور مجھے میرا ایک ایک ٹکا واپس چاہیے۔“

”میں نے تم سے پیسے خرچ کرنے کو نہیں کہا تھا۔ جس کے کے کر رہی ہو اس سے جا کر مانگو۔“ اس نے وہی کیا جو ہمیشہ سے کرتی آرہی تھی۔ چڑھائی۔ اگلے کو ایسا لگے جیسے زینیا حاکم نے تو یہ مانا ہی نہیں تھا۔

نینا ہلکا سا مسکرائی۔ ”جانتی ہو میری بھابی اور میری بنتی کیوں نہیں؟“ اس نے دہی کا چچ منہ میں رکھا۔ کھٹے ذائقے نے اسکی زبان کو لذت دی۔ ”جائیداد کے بٹوارے کے وقت میں نے گردن کی ہڈی پہ لات رکھ کر اپنا حصہ لیا تھا۔ مگر میرے بیس ہزار ٹکا بھائی کی طرف رہتے تھے۔ اس نے دینے سے منع کر دیا میں نے عدالت میں کیس درج کر دیا۔“ نوالہ ختم کر کے وہ ہنس پڑی۔ ”عدالت نے اس پہ تیس ہزار کا جرمانہ رکھ دیا۔“ وہ اور زور زور سے ہنسنے لگی، زینیا عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ”اپنے بھائی کو، سگے بھائی کو

کچہری کے دھکے کھلوائے ہیں میں نے پھر تم کون ہو؟ نیما راشدی نے دھرم شالہ نہیں کھول رکھی یہ تمہیں سمجھ آجائے گا۔“

”میں تم سے اور تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتی۔ سوائپر تو میں اس زندگی میں نہیں بن سکتی۔“ اس نے کہتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ نیما نے محض سر ہلادیا۔ اپنا کھانا مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زینیا کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے گھر کی چھت پہ آگئی۔ مغرب کا سہمے تھا ہلکی ہلکی خنکی اتر رہی تھی۔ زینیا سمجھ نہیں پائی وہ اسے یہاں کیوں لائی ہے۔

”نوابوں کی اولاد ہونا؟ یہاں رہو اب تم۔ یہاں کھا سکتی ہو تو کھاؤ پینا ہے تو پیو، کیونکہ میرا گھر کوئی دھرم شالہ نہیں ہے۔“

وہ شل رہ گئی۔ ”زندگی مل جائے ناں تو اس کا حساب چکانا پڑتا ہے۔ جنت سے نکالے ہوئے لوگ ہیں ہم دنیا میں سزا کے لئے بھیجے گئے ہیں کوئی نواب نہیں کوئی حاکم نہیں سب مجرم، سب ایک۔“ اس نے ساکت کھڑی لڑکی کے منہ پہ چھت کا دروازہ زور سے بند کیا۔ اور دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں طے کرتی چلی گئی۔ اسکے جانے کے بعد زینیا کو ہوش آیا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ کاٹھ کباڑ، کوڑا اور پھٹے پرانے قالینوں نے چھت کا کونہ کونہ ڈھک رکھا تھا۔ آس پاس کے گھروں کی چھتیں یہاں سے نظر آرہی تھیں۔

انا اونچی تھی سوا اونچی رہی وہ کسی کو آواز نہیں دے گی یہ طے تھا۔ ایک کونے میں اپنے لئے جگہ بناتے ہوئے وہ سکڑی سمٹی سی بیٹھ گئی۔ کئی منٹ، گھنٹے اور پھر پوری رات بیت گئی۔ سردی سے اسکے ہونٹ

اور ناک نیلی پڑ گئی تھی۔ پٹھوں میں اکڑاؤ کے باعث اسکے بازو میں بھی درد بھی ہونے لگا تھا۔ ایک رات ایک صدی ثابت ہوئی تھی۔

زندگی کے ہر موڑ پہ، ہر قدم پہ اسے کوئی نہ کوئی ملتا تھا۔ اپنی بھڑاس نکالنے کو، الزام دینے کو، وقت اور مرہم دینے کو۔ بھوک سے نڈھال ہوتے سردی سے ٹھٹھرتے، زخم میں اٹھتے درد کو سہتے آج زینیا حاکم کو اندازہ ہوا تھا زندگی کیا ہے وہ زندگی جس کی اس نے شکایت کی تھی۔ اسکے قریبی جن سے وہ نالاں رہی وہ کم از کم اسے یوں چھت پہ باندھ نہیں سکتے تھے۔ آج اسے رشتوں کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا جو اسے مہدی ہمیشہ سکھاتا آیا تھا۔ زندگی سے ناشکری پہ رنج ہوا، اور اپنے لہجے کی کڑواہٹ جسے وہ straight forwardness کا نام دیتی آئی تھی آج اسے ہر ایک شے معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے جیسے اسکی زندگی ایک پیپر ہو اور مستحکم نے سارے پرچے پہ سرخ کانٹے لگا چھوڑے ہوں۔ وہ اس روز بہت روئی تھی۔ کیوں اس نے زندگی دنیاوی معیاروں پہ گزاری، کیوں اس نے اتنے سال اپنی ذات کے ساتھ نا انصافی کی؟ اگلا دن بے حد کٹھن تھا اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اسکے پاس پین کمر نہیں تھے اسکے پاس حاجت کے سامان نہیں تھے۔ بھوک، ایسی شے ہے جو چھ فٹ کے مرد کو اپنے مالک سے گالیاں کھلواتی ہے، وہ تو پھر چوبیس سالہ صنف نازک تھی۔ کہاں کی انائیں کہاں کے بھرم سب بہہ گیا۔ وہ نقاہت زدہ وجود گھسیٹتے ہوئے اٹھی۔ آنکھیں صاف کیں۔ خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ اور پورے دو دن بعد وہ اس دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی جس کے پار اسے بھوک، کا علاج ملنے والا تھا درد سے راحت بھی اور وقتی سکون بھی۔ انسان جنت سے نکالا جائے تو دنیا میں راحت کے سامان پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ بھی نہیں رہ سکی۔ جنت سے نکالے جانے کے بعد آدم نے بھی زمین پہ سروائیو کرنا سیکھا تھا وہ بھی سیکھ لے گی۔ اس دروازے کے پار اسے جینا تھا۔

”زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے ”جوتا“ نہیں ”دل“ مضبوط ہونا چاہیے۔ دل بڑا خالص پرزہ ہے۔ اسکے گرد چڑھی پرت اگر جعلی ہوئی تو جلد اتر جائے گی۔“

اسے یہاں آئے ایک ماہ سے زائد کا وقت ہو چکا تھا، آج وہ پہلا دن تھا جب اس نے گھر سے قدم باہر نکالنے کا سوچا۔ سادہ سیاہ رنگ کے کرتے کے ساتھ سفید ٹراؤزر اور سر پہ ہم رنگ دوپٹہ اچھی طرح اوڑھے اس نے ہاتھروم میں کھڑے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ کینٹی اور رخسار پہ نیل تھا۔ ہونٹ کے قریب زخم کا نشان رہ گیا تھا۔ اور گردن پہ جلے کا نشان تھا۔ ایسے کئی زخم اسکے سارے جسم پہ تھے لیکن وہاں لباس تھا۔ اس نے بازو اوپر کرنے کی کوشش کی مگر وہ اب پوری طرح اوپر نہیں ہو پاتا تھا۔ کلائی سے اوپر جلے ہوئے زخم اب بھی ہرے ہی تھے۔ وہ قیس کمبیر کی عنایات کو ساری زندگی نہیں بھولنے والی تھی۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا زینیا کے سارے جسم میں آگ لگ جاتی تھی۔

عبایا پہنتے ہوئے اس نے چہرہ نقاب میں ڈھکا۔ اور کمرے کے باہر قدم رکھا۔ نیا اپنی بھابی سے بحث کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ وجیہہ نے زینیا کو دیکھا تو ناک بھوں چڑھالئے۔ ”جب بندہ خود دوسروں کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہو تو اس پاس کے لاچاروں کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔“

”صحیح کہتی ہو تم، اسی لئے کہہ رہی ہوں اپنی بہن کو پڑھانا ہے تو ہاسٹل ڈھونڈو یہ گھر دھرم شالہ نہیں ہے۔“ وہ پرس میں اپنا سامان رکھتے ہوئے وجیہہ کو آگ لگا گئی تھی۔ ”اب تم نے چلنا ہے بی بی یا تانگہ گھر منگو اوں؟“ اس نے اپنی دائیں طرف کھڑی زینیا سے کہا۔ وہ میکانیکی انداز میں اسکے پیچھے چلنے لگی۔ بس اسٹاپ پہ آکر وہ دونوں بچہ بیٹھ گئیں۔ نیا کے چہرے پہ ہمہ وقت کرختگی چھائی رہتی تھی۔

”آپ کے ہسپتال میں کوئی اور کام ہے؟ جسے میں کر سکوں؟“ خاموشی کا وقفہ لمبے وقت بعد ٹوٹا تھا۔ نیانے اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

”اب تو میرے ہسپتال میں بھی کوئی کام نہیں رہا بی بی، اب تم نے کام خود تلاش کرنا ہے۔ نیما راشدی کی آفرز محدود مدت کے لئے ہوتی ہیں۔“

”لیکن میں یہاں کیا کام کروں گی؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی آپ“

”جب جینے کی خواہش کی تھی تو سروسایول کے گھر بھی سیکھنے چاہیے تھے زوہرا متین۔“ اس نے منٹ کے اندر اندر اسے یہ سمجھا دیا تھا کہ اب دنیا زینیا حاکم کے حق میں نہیں ہے۔ ستارے آج کل گردش میں تھے۔

بس آئی تو وہ آگے بڑھ کر بس میں چڑھ گئی۔ زینیا بس اسکی پیروی کرتی رہی۔ سب عجیب تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ بعد گھر سے باہر نکلی تھی اسے روشنی آنکھوں میں چھ رہی تھی۔ لوگ، اسے یوں لگا لوگ اسے دیکھ رہے ہوں جیسے مرکز نگاہ بس وہی ہو اور کوئی نہیں۔ وہ انگلیاں مروڑتی رہی، حجاب درست کرتی رہی۔ قیس کبیر نے اسکی ذات کا اعتماد چھین لیا تھا۔ اگلے اسٹاپ پہ نیما اتر گئی۔ چار ونا چار زینیا کو بھی اترنا پڑا۔ ”یہاں سے تمہارے اور میرے راستے جدا ہوئے، اب تم اپنے سفر پہ جاؤ گی۔“ تیمانے اسکے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ زینیا کی ہتھیلیاں پسینے سے بھگنے لگ گئیں۔ ”اگر کھو جاؤ تو یہ ایڈریس ہے۔ گھر آ جانا۔“ اس نے ایک چھوٹا سا کاغذ اسکی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے مرے مرے ہاتھوں سے تھام لیا۔

وہ کارڈ لئے ایک طرف چلنے لگی۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی، کبھی چلتے چلتے رک جاتی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ چلنا بھول چکی تھی۔ چند قدم چل کر اسکا سانس پھول گیا۔ اس نے ایک جگہ ٹھہر کر اپنے اطراف میں دیکھا۔ گاڑیاں، ٹریفک، لوگ، شور وہ پنوں کے بل سڑک کی ایک طرف نیچے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ

کانوں پہ رکھ لئے۔ آنسو تو اتر سے بہنے لگے۔ یہ لوگ، دنیا، شور ہر شے کیوں اسے خوف زدہ کر رہی تھی اسے غصہ آنے لگا۔ اسے ہر شے بہت بری لگ رہی تھی۔

کسی نے آکر اسے کندھے سے ہلایا تو وہ اٹھی۔ وہ کوئی ضعیف مرد تھا جو اس سے بنگالی زبان میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ یہ فرسٹریشن کا اعلیٰ درجہ تھا جہاں اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ وہ اٹھی اور تیز تیز قدم لیتی وہاں سے چلی گئی۔

ڈیڑھ سے دو گھنٹے بعد اس نے خود کو ایک نجی اسکول کے اندر پایا۔ جہاں پہلے سے کئی خواتین انٹرویو کے لئے موجود تھیں۔ انہوں نے زینیا سے کچھ پوچھا اسے جواب نہیں آیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔

”آپ انٹرویو کے لئے نہیں جاسکتیں مس، جن لوگوں کو بلایا گیا ہے صرف وہی جاسکتی ہیں۔“ کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ ریسپنشنسٹ تک گئی تاکہ وہ اسے اندر بھیج سکے۔ مگر اس ٹکے سے جواب پہ وہ اگلے چند پل خاموش رہ گئی۔ ”اور آپ کو یہ جاب ملنے کے چانسز بھی بہت کم ہیں کیونکہ آپ کو بانگلہ نہیں آتی۔“ اس نے بڑی شائستگی کے ساتھ زینیا کے مستقبل کا نقشہ کھینچا۔

یہاں بس نہیں ہوئی تھی۔ ہسپتال کی ریسپنشنسٹ، سکول کی ٹیچر، اکیڈمی کی ٹیوٹر، اور فیکٹری میں ملازمت تک لئے اسے کبھی سی وی لانے کو کہا گیا اور کبھی بانگلہ نہ آنے کی وجہ سے معذرت کی گئی۔ اس نے ساری زندگی مواقع کیش کئے تھے۔ اسکاٹیلنٹ اور ذہانت کافی حد تک اسے مغرور کئے رکھتا تھا آج سب ہوا ہو گیا۔ سب نل، خالی۔ کون زینیا حاکم، کیا ٹیلنٹ سب ردی تھا۔ اس دنیا میں کوئی انسان کچھ نہیں تھا جو دینا تھا اللہ نے دینا تھا جسے اس نے کبھی اپنی کامیابیوں میں اسے یاد نہیں کیا تھا۔

اس نے گھر جانا چاہا مگر اسکے پاس پیسے تک نہیں تھے۔ وہ ہسپتال کے باہر سڑک کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ہر کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ ہر کوئی اسے دیکھے گا۔ ہر کوئی اسکی بات کر رہا تھا۔ ہر کوئی اس پہ ہنس رہا تھا۔ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔ سب جامد، سب تیز، سب عجیب۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آتے جاتے لوگوں کے درمیان وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔ ڈپریشن . . . کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے جارہے تھے کوئی کسی کے لئے نہیں رکا۔ کون رکتا ہے؟

کئی منٹ بعد نیما اندر سے آتی دکھائی دی۔ اس نے کوئی فکر مندی نہیں دکھائی۔ بس چند پل اسے رونے دیا اور پھر اسے ساتھ لئے بس میں چڑھ گئی۔ گھر آکر اپنا سامان زینیا کے ساتھ کمرے میں منتقل کیا۔ رات کے پہر پلنگ پہ بیٹھے ہوئے نیما نے بے حد غور سے اسے کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ شاید اسے گھٹن ہوا کرتی تھی۔

”تمہارے متعلق اپنے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہے میں نے، تمہارا پر اپر چیک اپ کر دیں گے۔“
 ”مجھے جاب نہیں ملی، اور نہ ملے گی۔“ اسکی آواز ہلکی تھی۔ ”میں کبھی کچھ نہیں کر سکوں گی سب برباد۔“
 ”زندگی ایک جاب نہ ملنے سے ختم نہیں ہوتی۔ کوئی تمہیں برباد نہیں کر سکتا جب تک تم ہونا نہ چاہو۔“

”اب میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ اب سب ختم۔“ اسکی آواز اب کے نیما تک نہیں پہنچ سکی۔ باہر سے آتے وجیہ کے شور میں ساری آواز دب گئی۔ وہ کتنے گھٹنے وہاں کھڑی رہی اسے اندازہ نہیں ہوا۔ نگاہوں کے آگے بس منظر بدلتے رہے۔ پولیس، عدالت، کمرہ نقشبش، ڈھاکہ پورٹ، وہ جہنم جیسی دوراتیں، وہ جلتا ہوا بازو اور پھر اس نے کھڑکی پہ رکھی چھری اٹھائی۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے بیٹھی۔ آنکھیں بند کیں

اور ایک ساتھ کلائی پہ تین سے چار کٹ دے مارے۔ خون بھل بھل کلائی سے بہتے ہوئے فرش کو سرخ کرتا چلا گیا۔ تکلیف سے اسکے حلق سے کراہ برآمد ہوئی۔

تکلیف بڑھ گئی، پھر ختم ہو گئی، آنکھیں کھلی رہیں پھر بند ہو گئیں اور تاریکی میں جاتے وقت اسکی آنکھوں کے پار سبز آنکھیں تھیں ان میں ناگواری تھی۔ اب وہ ان آنکھوں کو کہاں دیکھ پائے گی اب تو سب ختم۔ اب تو بس۔

”قصہ اٹھارہ جنوری سے، تینئیس جنوری کا۔“

”وائٹ روم ٹارچر تاریخ کے بدترین ٹارچرز میں شمار ہوتا ہے۔ اس ٹارچر میں قیدی کو ایک سفید کمرے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ جہاں دیواریں، چھت، سیلنگ، روشنی، کھانا سب سفید ہوتا ہے۔ قدرتی روشنی کا وہاں کوئی گزر نہیں ہوتا وہاں تنہائی ہوتی ہے اور اکیلا پن۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE .Disorientation

آنکھیں متوحش انداز میں پھیلائے وہ آس پاس دیکھ رہا تھا۔ یہاں آنکھ کھلے دوسرا دن تھا اور وہ ابھی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے دیوانہ وار اٹھ کر دروازہ بجانا شروع کیا۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ پڑ رہی تھیں اور دکھ بھی رہی تھیں۔ اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا یہ سفید رنگ اسے پاگل کر رہا تھا، اور وہ ہو رہا تھا۔

”مجھے یہاں سے باہر نکالو۔۔۔ زر قون۔۔۔ میری آنکھوں کو کچھ ہو رہا ہے پلیز مجھے باہر نکالو۔“ اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، مگر وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔ جواب نہ ارد۔ آوازیں پلٹ پلٹ کر واپس آ جاتی تھیں۔ جواب کوئی نہیں آتا تھا۔ اسے بے تحاشا خوف آرہا تھا۔ زر قون سے، موت سے، انسانوں سے۔ اس صیاد سے جس نے اسکے مقدر میں یہ قید لکھی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے لوگ فیسینیٹ نہیں کر رہے تھے۔

”یہ ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جو ساؤنڈ پروف ہوتی ہے۔ کوئی آواز، کوئی لہجہ یہاں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ لوگوں اور باہر کی دنیا سے مکمل قطع تعلق انسان کو توڑنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔“

.Confusion

دن، منٹ، گھنٹے حساب چھوٹ گیا تھا۔ وہ انگلیوں پہ سیکنڈز اور منٹ گن رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں وہ نہیں دیکھے گا اس رنگ کو نہیں دیکھے گا وہ کچھ بھی نہیں دیکھے گا۔ مہدی کبیر آنکھیں بند کئے بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے کتنے وقت سے کوئی آواز نہیں سنی تھی ایک پبلک اسپیکر، ٹریولر وہ جس کے آس پاس دنیا تھی جس نے اکیلا پن نہیں دیکھا تھا۔ یہاں اس قید میں جیسے اس سے زندگی لے لی گئی ہو قطرہ قطرہ موت کیا ہوتی ہے یہ اسے اب پتہ چل رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پار اسکے سامنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ جس کی آنکھیں سبز تھیں۔ اسکے آگے ایک بچہ بیٹھا تھا جس کے ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ آس پاس مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن پڑے تھے۔ عورت اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ بچہ منہمک تھا۔

”تم ایک دن بہت آگے جاؤ گے، بہت آگے۔ لوگوں کے ساتھ مہربان رہنا اور ہمت مت ہارنا۔“ ششتمے انگریزی میں کہے اسکے لفظوں پہ بچے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر منظر دھندلا پڑ گیا۔ اسے عورت کا چہرہ

صاف نظر نہیں آیا۔ وہاں سفیدی چھا گئی۔ سبز آنکھیں، وہ مہربان وجود سب دھندلا پڑ گیا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں اور ایک اور منظر دیکھنے کی کوشش کی۔

سنہری آنکھیں، ہنستا ہوا چہرہ، پھر روتے ہوئے اسکی متورم آنکھیں۔ منظر پھر ٹوٹ گیا۔ سفیدی ہر طرف سفیدی چھا گئی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول لیں۔ اپنے اطراف میں دیکھنے پہ اسے آنکھیں چھوٹی کرنی پڑیں، وہاں رنگ دکھ رہے تھے اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھیں صاف کیں رنگ غائب۔

کنفیوژن بڑھتی جا رہی تھی وہ یہاں رہ کر اپنے حواس کھو سکتا تھا یہ طے تھا۔ وہ حواس کھو رہا تھا یہ علم اسے نہیں ہوا۔ ”مجھے یہاں کون لا سکتا ہے؟“ یہ سوال ہر پل اس کے ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا۔

”وائٹ روم میں دن، گھنٹوں اور منٹوں کا حساب نہیں رہتا۔ اس قید خانے میں جہاں رنگ نہ ہوں انسان بہت جلد اپنے حواس کھونے لگتا ہے یا پھر اسے پریشانی ہونے لگتی ہے۔ عام قید کے برعکس یہ قید انسان کے ذہن پہ بہت برا تاثر چھوڑتی ہے جس سے اسے انگڑائی اور بینک انکس ہو سکتے ہیں۔“

.Anxiety
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ تھک کر واپس اپنی جگہ پہ آکر بیٹھا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا وہ رنگ آنکھوں میں چھنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جلن بڑھ گئی۔ اسکا معدہ خالی تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پہ رکھے سفید باؤل میں، سفید چاول اٹھا کر دیکھے۔ چند پل دیکھتا رہا پھر نوالہ بنایا۔ آنکھیں بھر رہی تھیں مگر اس نے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ چہرہ گیلا ہو گیا۔ جسم میں طیش اور بے بسی کی لہر اٹھی مگر وہ چپ چاپ نوالے لیتا رہا۔ نہ ذائقہ، نہ رنگ۔ وہ ہر نوالے کے ساتھ روتا رہا۔ کئی سال ہوئے تھے اس نے دنیا کے کونے کونے سے ہر طرح کا

کھانا کھایا تھا۔ مگر یہ کھانا کھاتے ہوئے اسے احساس ہوا ذائقہ کیا ہے۔ اور وہ کس طرح اسکی زندگی سے رخصت ہوا ہے۔

لندن، اٹلی، بارسلونا، لاہور، کراچی، نیویارک وہ ایسے ہر بڑے چھوٹے شہر کے مشہور کھانے کھانے والا شخص تھا یہ سفید بد ذائقہ چاول اس کے لئے زہر ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے کھانا چھوڑ دیا اور واپس اس میٹرس پہ آکر بیٹھا۔ آنکھیں بند کیں مگر اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گردن اور چہرے پہ پسینہ آرہا تھا۔ اسے انگڑائی ہو رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں اسکا سارا بدن پتے کی مانند کانپ رہا تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی بے حد سردی۔ فرش پہ لیٹے اس گھٹنے سینے سے لگانے چاہے تو سینے میں شدید درد اٹھا۔ مہدی چت لیٹ گیا۔ کپکپاہٹ کم ہوئی اور اب اسے گرمی لگنے لگی۔ بے بسی تھی کہ کیا وہ چیخ چیخ کر حلق کے بل قیس کو بد دعائیں دیتے ہوئے رو رہا تھا۔

یہاں سے نکالو مجھے تم کون ہوں؟ کیوں ”مجھے یہاں رکھا ہوا ہے۔ اللہ کا واسطہ ہے مجھے نکالو یہاں سے۔“

”لوگ، رونق، اور رنگ اگر کسی نارمل انسان سے لے لئے جائیں تو اسکی زندگی میں باقی کچھ نہیں بچتا۔ وائٹ روم میں قیدی سے کوئی ملتا نہیں، کوئی بات نہیں کرتا، کوئی دھیان نہیں رکھتا۔ تنہائی... یہ تنہائی انسان کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ اور انسان پوری طرح سے ٹوٹ جاتا ہے۔“

.Depression

چت لیٹے ہوئے لب سیدھی لکیر میں بند کئے وہ چھت کو دیکھ رہا تھا۔ ہر امید کھو چکی تھی۔ وہ یہاں سے کبھی نہیں نکل سکتا اس نے یہ مان لیا تھا۔ کھانا، پانی وہ ہر شے فراموش کئے بیٹھا تھا۔ زندگی سے پوری طرح مایوس ہو گیا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے روتا رہتا یا سردیوار میں مارتا۔ پھر چند منٹ کے لئے اٹھ بیٹھتا، چپ چاپ

دیواریں دیکھتا اور کسی آواز کے سننے کا منتظر رہتا مگر آواز نہیں آرہی تھی۔ کوئی انسان نہیں تھا، کوئی اس سے بات کرنے والا نہیں تھا۔ یکدم اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے چھوا ہو۔ وہ برق رفتاری سے اٹھ بیٹھا۔ آس پاس دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ خوف ایسا خوف اسکے دل میں گھر کر گیا کہ مہدی کمبیر بیٹھے بیٹھے جامد ہو گیا۔ وہ ہر اسال نگاہوں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔

”زر قون“ وہ چلایا۔ آوازیں پلٹ پلٹ کر واپس آئیں۔ ”یہاں کون آیا تھا؟ کوئی ہے؟ میری بات سنو پلیز۔“ وہ اس خالی کمرے میں چلا چلا کر اسے بلارہا تھا جو اس کا صیاد تھا۔ ”تم کس کے کہنے پہ مجھے یہاں لائے ہو مجھے کچھ تو بتاؤ کیوں کر رہے ہو ایسا۔ میری بیوی کہاں ہے؟ مجھے جانے دو، میں اسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ وہ مصیبت میں ہوگی۔“

کوئی جواب نہیں کوئی آواز نہیں کوئی لوگ نہیں سب خاموشی، ساری تنہائی۔ وہ تھک کر لیٹ گیا۔ مایوسی ایک بار پھر چھانے لگی۔ یہاں سے نکلنے کی ہر امید دم توڑ رہی تھی۔ یا شاید توڑ چکی تھی۔ اسے غصہ آرہا تھا تھا۔ رونا آرہا تھا۔ وہ یہاں بیٹھا اگر کچھ سوچ رہا تھا تو یہ کہ اسے یہاں لانے والا کون تھا؟

”سفید رنگ، لباس، کھانا دیکھتے دیکھتے اور اس تنہائی میں انسان اس قدر تھک جاتا ہے کہ وہ چیزیں فرض کرنے لگتا ہے۔ hallucinate کرتا ہے۔ اسے اصل اور نظر کے فریب کا فرق بھول جاتا ہے۔ یہ قید موت سے زیادہ بدتر ہوتی ہے۔“

Hallucination

اس نے دیوار پہ کیڑے رہتے ہوئے دیکھے۔ وہ کیڑے پھر تیزی سے اسکی طرف آئے اور اسکے سارے جسم سے چٹ گئے۔ وہ دیوانہ وار اپنے جسم سے انہیں جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ اس سے چٹ رہے تھے۔ پھر یکدم سب کیڑے اسکے جسم سے ہٹ گئے۔ وہ گہری سانسیں بھرتے ہوئے ساکت ہو گیا۔ کیا یہ کوئی برم تھا؟ اسکے گلے میں گلی ابھر کر معدوم ہوئی۔

سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آنکھیں ایسے تھیں جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ پھر اس نے واقعی وہی دیکھا۔

دیوار کے ساتھ لگ کر قیس کھڑا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑی زینیا سے کچھ کہہ رہا تھا وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ آدمی سختی سے اسکی کلائی دبوچے ہوئے تھا۔ مہدی نے خود کو اٹھتے ہوئے دیکھا وہ انکی طرف بڑھا مگر منظر پانی کے بلبے کی طرح تحلیل ہو گیا۔ مہدی کو یوں لگا جیسے کسی نے اسکے منہ پہ تھپڑ دے مارا ہو۔

اگلے لمحے میں اس نے زرقون کو دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ وہ مہدی کے قریب آیا اور اسکا گلابا بنا چاہا۔ وہ چیخ رہا تھا خود کو چھڑوا رہا تھا مگر ہر عمل مشکل سے مشکل ترین تھا۔ اسے لگا وہ مر جائے گا جب اسے اپنے گلے پہ پڑے ہوئے ہاتھ دور جاتے ہوئے دکھے۔ سب برم تھا سب جھوٹ۔ مہدی کبیر پاگلوں کی طرح رونے لگا۔ وہ یہاں پاگل ہو جائے گا اسے یقین آنے لگا۔

”میں مر جاؤں گا پلیز مجھ سے بات کرو۔ مجھ سے بات کرو کوئی۔ میں ایسے نہیں رہ سکتا میں پاگل ہو رہا ہوں مجھے نکالو۔ مجھے یہاں سے باہر لاؤ میں مر جاؤں گا مجھے مرنا نہیں ہے پلیز۔“

وہ گھٹنوں کے بل فرش پہ بیٹھے ہوئے شدت سے رو رہا تھا کوئی اسے سننے والا نہیں تھا۔ کوئی اس سے اسکا غم نہیں پوچھ رہا تھا، کسی کو اسکی پرواہ نہیں تھی۔ قید خانہ اب امتحان لینے پہ آیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پہ تھپڑ مار رہا تھا اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اور ایک التجا کر رہا تھا۔ ”تمہارا باس کون ہے؟ میری بات کرو اور اس سے پلیز میں یہاں اس طرح مرنا نہیں چاہتا۔“

”بعض دفع قیدی کو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ جو اسے بتایا جا رہا ہے جو اسے یاد ہے یہ اسکی اصل شناخت نہیں ہے۔ قید خانے کے باہر چند لوگوں کو کھڑا کیا جاتا ہے جو اسیر کے خاندان کا متعلق جھوٹ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ جھوٹے مقدمات کا ذکر کرتے ہیں اور جھوٹی اموات پہ چرچہ کرتے سنائی دیتے ہیں۔ ایسے میں اسیر اپنی اصل شناخت کھونے لگتا ہے۔ یہ اسکے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے۔“

identity of Loss

”کتنے دکھ کی بات ہے ناں؟ وہ لڑکی زینیا اس نے شادی کر لی۔ وہ بھی قیس کبیر سے۔“ وہ نیند سے جاگا تھا جب اسے سب سے پہلے یہ الفاظ سننے کو ملے۔ اسکی رگوں میں لاوا دوڑ گیا۔ ”بتا رہے تھے کہ تیس لاکھ حق مہر لیا ہے اور کل دبئی گئے تھے ناں؟“ باہر کوئی اب بھی کہہ رہا تھا۔ مہدی کی نیند بھک سے اڑ چکی تھی۔

”کیا فائدہ بیچارے مہدی کو گولیاں لگو کر اسکی زندگی برباد کر کے اب دونوں سکون سے رہ رہے ہوں گے۔ مجھے تو لگ رہا ہے اس سارے قصے میں لڑکی بھی شامل رہی ہوگی۔“

”اپنی بکواس بند کرو میں جانتا ہوں تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ حلق کے بل غرایا۔ ”وہ میری بیوی ہے اسکے خیال تک مجھ تک محدود ہیں۔ اس پہ الزام لگانا بند کرو۔ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”تصاویر دیکھنا چاہو گے؟“ باہر کھڑے دو لوگوں نے بے ہنگم طریقے سے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”نہ وہ اب تمہاری بیوی ہے اور نہ اب قیس تمہارا بھائی۔ سب ختم ہے۔“

”میں تم پہ اور تمہاری تصاویر پہ لعنت بھیجتا ہوں۔ کوئی انسان، کوئی شیطان، کوئی طلسمی طاقت مجھے میری بیوی کے خلاف نہیں کر سکتی۔“ اسکا لہجہ ہنوز بلند تھا۔ باہر کھڑے دونوں لوگ اب اسکی بیوی کے متعلق اخلاق سے گری باتیں کر رہے تھے۔ وہ مہدی کا ضبط آزار ہے تھے۔

اندر بیٹھے شخص کا بس نہیں چلتا تھا وہ انکی زبانیں کھینچ لے۔ چند پل بعد وہ چلے گئے۔ مہدی کے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔ ”کیا قیس نے اس سے زبردستی شادی کی ہوگی؟ یا وہ واقعی مر گئی تھی۔ کیا وہ مہدی کو مردہ مان چکی ہوگی۔؟“

اس نے سر جھٹکا لمبے گہرے سانس لئے۔ خود کو پرسکون کیا۔ ”وہ تو پارٹی میں بھی قیس کے لئے آئی تھی۔ دیکھا تھا ناں سرخ لباس۔ اوہ بیچارہ مہدی۔“ آوازیں انکے جانے کے بعد وہیں امر ہو گئی تھیں۔

مہدی نے آنکھیں بند رکھیں، کانوں پہ ہاتھ رکھے، اور بڑبڑانے لگا۔ ”میں مہدی کمبیر ہوں۔ زینیا حاکم میری بیوی ہے۔ میں مہدی کمبیر، زینیا حاکم میری بیوی ہے میں مہدی“ آوازیں ہلکی ہوتی چلی گئیں مگر دل میں جو تھا وہ گہرا تھا سو گہرا رہا۔

.suggestibilityincreased

”قیدی کو توڑنے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے پاس اول تو کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا اور ایک سے ڈیڑھ دن بعد اگر اسے کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ اسے

حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔ وہ نرا جھوٹ ہوتی ہے مگر چونکہ وہ اس قید میں فرسٹریٹ ہو چکا ہوتا ہے وہ ہر کبھی ہوئی بات پہ یقین کرنے لگتا ہے۔“

”اسکا بھائی اور اسکی بیوی کتنے خوش تھے ناں؟“

”آہ بیچارہ، اب اسکا کیا ہو گا؟“

”خدا ایسی بیوی کسی کو نہ دے جو شوہر کو چھوڑ اسی کے بھائی کے پیچھے لگ جائے۔ ویسے اسکا بھائی؟ یہ قید میں بھی تو اسی نے ڈالا ہے ناں؟“

اندر اس چھوٹے اور غلیظ قید خانے میں بیٹھے ہوئے مہدی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ نیم پاگل لگ رہا تھا۔ آنکھیں دور کہیں جمی تھیں۔ ان میں سرخی اور وحشت تھی۔ جسم میں جگہ جگہ انفیکشن ہو رہے تھے۔ دھوپ اور تازہ ہوانہ ملنے کے باعث اسکی کھال عجیب سی ہونے لگی تھی۔ وہ تھک چکا تھا اب باہر جو بھی کہا جا رہا تھا وہ انہیں جواب دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ یہ قید خانہ اب اسکی آخری قیام گاہ تھی اسے یقین آنے لگا۔ اسے اگر اب کسی چیز کا انتظار تھا تو وہ موت تھی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ لوگ ایک بار پھر باہر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تھے۔ مہدی چند پل سنتا رہا۔ پھر ہنس پڑا۔ اور اگلے پل وہ دیوانوں کی طرح اونچا اونچا ہنس رہا تھا۔ ہنستے ہنستے اسکے جبرے دکھ رہے تھے مگر وہ رکا نہیں بس ہنستا گیا۔ باہر کھڑے لوگوں کی آوازیں جتنی اونچی ہوتیں وہ اس سے زیادہ اونچا ہنستا۔

اور پھر یونہی ہنستے ہنستے وہ یکدم رو پڑا۔ ”میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“ گھٹی گھٹی سسکیوں کے درمیان وہ کرب سے کہہ رہا تھا۔ ”میری بیوی سے کیا دشمنی ہے کیوں تم لوگ اس پہ الزام لگاتے ہو کیوں کرتے ہو ایسا؟“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ ”میرا اللہ پوچھے گا، اللہ تم لوگوں کو غارت

کرے گا۔ میرا اللہ حساب لے گا۔ میں یہاں سے نکل کر تم سب کو برباد کروں گا۔ میں تمہاری زندگی میں تمہاری قبریں بناؤں گا۔“

اسکے لہجے میں کئی زمانوں کا رنج تھا۔

.Breakdown

”کچھ قیدی چند دن میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو ہفتا لگتا ہے اور کچھ ایک سے دو ماہ تک۔ لیکن اس قید میں دو ہفتے سے زیادہ وقت گزارنا ممکنات میں سے ہے۔ اور اگر کوئی گزار بھی لے تو واپسی پہ وہ کبھی نارمل انسان کی طرح نہیں جاتا۔ وائٹ روم ٹارچر انسان کو مسخ کر دیتا ہے۔ اسکی شخصیت پوری طرح تباہ کر دیتا ہے۔“

سفید چاول اور وہ سفید مائع سے اسکا جی بری طرح اکتا چکا تھا۔ اسکا وجود کسی لاش کی طرح لاغر ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور ہونٹ پیڑی زدہ۔ نقاہت سے اسکا برا حال تھا۔ یہ وہ مہدی نہیں تھا جسے تم نے اعلیٰ لباس پہن کر اسٹیج پہ چڑھے تقریریں کرتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ جسے انٹرنیشنل فارمز پہ مدعو کیا جاتا رہا تھا۔ یہ انسان زندگی سے ہر امید چھوڑ چکا تھا۔

”زر قون“ اس نے ہلکی آواز میں پکارا۔ بیٹھی ہوئی، خالی آواز۔ ”مجھے کچھ کھانے کو دے دو پلیز۔ . . میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بار، مجھے میرا قصور بتا دو میں معافی مانگ لوں گا۔ تم جو چاہو گے میں وہ کروں گا مجھے یہاں سے نکالو۔ میں یہ نہیں کھا سکتا یہ عجیب ہے پلیز مجھے کچھ اور دے دو۔“

خاموشی . . . خاموشی . . . کوئی آواز نہیں۔ وہ چند پل خاموش رہا پھر غصہ عود کر آیا۔

اسکے اندر اشتعال نے سراٹھایا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے چہرے پہ تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ ”میں یہی ڈیزرو کرتا ہوں ناں؟ ماروں مجھے۔ اگر تم میں غیرت ہے تو آؤ مارو مجھے۔“ اپنا بال مٹھیوں میں نوچتے، چہرے اور سینے پہ دھڑا دھڑا تھپڑ مارتے اس پہ ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ ”تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے مار دو پلیز۔ میں مرنا چاہتا ہوں میں بس یہیں ابھی کے ابھی مرنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے مار دو۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا میں نہیں گزارنا چاہتا انسانوں سے خوف زدہ، انکی نفسیات سے ہارا ہوا مہدی کمبیر ٹوٹ رہا تھا۔

اسکا کرب، تکلیف بڑھتی چلی گئی۔ لاغر وجود اور چیختا چلاتا حلق جب تھک گیا تب وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ بربیک داؤن شروع ہو چکا تھا یا شاید ہو چکا تھا۔

Safar-e-Adab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”قصہ اٹھارہ جنوری سے تینیس جنوری کا۔“

”کراچی پاکستان۔“

”تعصب، غصے اور جنون میں انسان وہ عمل کر بیٹھتا ہے جن پہ اسے پچھتنا پڑتا ہے۔ جھیلنا پڑتا ہے۔ یہ وہی وقت تھا۔“

کراچی کے سیون سٹار ہوٹل کے ایک پر تعیش سویٹ کی بالکنی میں راکنگ چیئر پہ جھولتے قیس کی انگلیوں میں سگار دبا تھا۔ آج کل اسکی عادت ڈبل سے ٹرپل ہو گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح سر سے پیر تک نک سک سے

تیار ماہ جبین ذرا فاصلے پہ سویت کے اندر کھڑی تھی۔ اسکے سامنے پولیس افسر کھڑا تھا۔ جو بے حد تابعداری سے چوتھی دفع اپنا مدعا بیان کر چکا تھا۔

”لڑکی کے بھائی اور سابقہ دیور پہ کچھ ثابت نہیں ہو تا میڈم۔ یہاں تک کہ اسلام آباد سے پولیس افسر وریام اور صنوبر یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جس روز پولیس کی گاڑی پہ حملہ ہوا اس حملے میں بشر اور ضیغم شامل نہیں تھے۔“ ڈی آئی جی بولتے ہوئے رکا۔ ایک نظر بالکنی میں بیٹھے مرد کو دیکھا پھر کہنا جاری رکھا۔ ”جب پولیس ہی شناخت نہیں کر رہی پھر ہم آگے کاروائی کس طرح کریں؟“

”وہ بکا ہوا ہے لڑکی کا عاشق ہے وہ۔“ ماہ جبین تنفر سے بولی۔

”یہ انکوائری ثابت کرے گی میڈم ہم کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ وہ ایک بار پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”لڑکی کی بہن کے متعلق پولیس تفشیش بھی یہی کہتی ہے کہ وہ اپنے بھائی اور دیور کے ساتھ تھی، یہاں کیس ہی دوسرا بن گیا ہے۔ لڑکی کے دادا نے پولیس پہ ایف آئی آر کٹوا دی ہے کہ لڑکی کی گمشدگی میں انتظامیہ کا ہاتھ ہے۔ آپ قابل احترام ہیں لیکن پولیس کا ایک procedure ہوتا ہے۔ ہمیں اسے فالو کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے گلا کھنکھارا۔ ”لیکن ایک تجویز ہے۔“

قیس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ نگاہوں میں خالی پن تھا۔ ماہ جبین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ”اس وقت بھی انتظامیہ اس سارے مسئلے سے آنکھیں چرائے ہوئے ہے کیونکہ سارا مسئلہ قبائلی دشمنی کا بھی ہے۔ تو اگر کمبیر صاحب قبائلی طریقے سے . . . میرا مطلب ہے پھر پولیس آنکھیں بند کر کے بیٹھ سکتی ہے۔“

اس نے نگاہیں واپس موڑ لیں۔ دل میں بے چینی اور بنجر پن جڑ پکڑ گیا۔ اسے کہاں اب انتقام چاہیے تھا؟ اسے کہاں جنگیں لڑنی تھیں۔ وہ بس ایک بار اسے دیکھ لینا چاہتا تھا جو اسکی آتی جاتی سانسوں کی ضمانت تھی۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ بس وہ واپس آ جائے۔

”ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دنیا کی ہوائیں تک انسان کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ ستارے ایسی گردش میں آتے ہیں کہ انسان کا سارا وجود ہل کر رہ جاتا ہے۔“

یہ ریستوران سمندر کنارے واقع تھا۔ بھورے رنگ کی لکڑی کے نقش و نگار کے انٹیریر والا وہ ریستوران کافی لوگوں کی موجودگی اپنے سینے پہ لئے ہوئے تھا۔ لکڑی کی چھوٹی سی ریلنگ کے دوسری طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ میز پہ کھانا پڑا تھا۔ سمندر کے پانی کے اوپر بگلے اڑ رہے تھے۔ ماحول خوبصورت اور پرسکون تھا مگر اسکا دل نہیں۔ زرد تیتوں کے حالے میں اسکے چہرے پہ چھائی مردنی واضح تھی۔ سیاہ تھری پیس میں ملبوس اسکے چہرے پہ سوگواریت تھی۔ گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے کھانا چکھتا تک نہیں تھا بس روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتا وہ بگلوں کی طرف اچھال رہا تھا۔ فضاؤں میں اڑتے بگلے فوراً روٹی کا ٹکڑا منہ میں لے لیتے اڑ جاتے۔

ریستوران کی دوسری جانب راہداریوں کے درمیان کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا چلتا آ رہا تھا۔ سفید رنگ کی شرٹ کے ساتھ سیاہ پینٹ اور سیاہ پی کیپ پہنے وہ چہرہ جھکائے چل رہا تھا۔ قیس کمبیر کے میز کے سامنے والی کرسی کھینچتے ہوئے اسکے انداز میں ناگواری تھی۔ ”میں ایسے پبلک سیلےز پہ نہیں ملتا جانتے نہیں آج کل ملک میں کتنا مشہور ہو رہا ہوں میں؟“

قیس نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ ہنوز روٹیوں کے ٹکڑے کر رہا تھا۔ ”جو چاہتے ہو بتاؤ، میں دنیادے سکتا ہوں تمہیں۔ بدلے میں صرف ایک سوال۔“ وہ کہاں ہے؟“ کہتے ساتھ اس نے جیب سے ایک چیک نکالا اور وریام کی طرف کھسکایا۔ ”جتنا لکھ سکتے ہو اتنا لکھو۔ جتنا چاہتے ہو اس سے دگن دے سکتا ہوں۔ بس ایک جواب۔ صرف ایک۔“

وریام نے چیک اٹھایا۔ پھر قیس کو دیکھا۔ اسکے لب ہلکی سے مسکراہٹ میں ڈھلے۔ ”میں کہاں کچھ جانتا ہوں کمبیر صاحب۔ آپ ہی نے کہا تھا اس لڑکی کی چمک آنکھ کو اندھا کر سکتی ہے۔ سمجھیں میں اندھا تھا۔“ قیس نے اسکی طرف دیکھا۔ حلق میں چھن تھی۔ ہر چہرہ، ہر منظر، ہر شے خالی تھی۔ وہ چند لمحے اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر شہر قائد کی ہواؤں نے کچھ ناقابل یقین سنا۔ ”پلیز...“ ہر انا اور خود داری کو قدموں تلے روند کر کہا۔ ”وہ میرے دل کا مسئلہ ہے۔“

وریام کو اس شخص پہ غصہ آیا۔ اسکا جی چاہا تھا وہ پستول کا سارالوہا اسکے اندر اتار دے۔ وہ اب بھی کیا اب بھی یہ دعویٰ کر سکتا تھا؟ اور اگر کر رہا تھا تو اسے یہ حق کس نے دیا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”میرے لئے دل کے مسئلوں سے زیادہ اہم، انسانی مسائل ہیں۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قیس کے چہرے پہ شکستگی تھی، آنکھوں میں ہار۔ ”یہ آپ نے چنا ہے کمبیر صاحب۔“ تنفر سے کہتے ہوئے وہ اس پہ ایک بھی نگاہ غلط ڈالے بغیر چلا گیا تھا۔ قیس نے گردن ترچھی کر کے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے رخ پھیر لیا اور اپنے مشغلے میں لگ گیا۔ اب کی بار ہاتھوں کی حرکت سست تھی۔

دل پہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی سہ اسکے نیچے دب کر ڈھے سکتا تھا۔

”دل نے ایسے ایسے سو رما قدموں تلے روندے ہیں جن کے نشان تاریخ کے پنوں میں بھی نہیں مل سکے۔ وقت گواہ ہے محبت نے محبت والوں کو ایسی جگہ خوار کروایا ہے جہاں مانگنے پہ رحم بھی نہ ملے۔“

ٹرپل سٹوری گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ مکین رخصت ہو چکے تھے۔ وقت کے چکر پلٹ چکے تھے۔ آمنے سامنے رکھے صوفوں پہ تین مرد بیٹھے تھے۔ قیس اور اسکے سامنے حاکم، اور بشر۔ انکے درمیان ایک آکورد صور تھال تھی۔

”کوئی بربادی رہ گئی ہے عبداللہ زمان؟ کوئی ذلت باقی ہے جسے ہمارے بخت میں لکھنے آئے ہو؟“ حاکم کے جھکے ہوئے کندھے مزید جھک گئے تھے۔ ”جو تم نے کیا وہ تو ہماری سات نسلوں میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ ایسا انتقام؟“

”کوئی کسی کے خاندان کو زندہ بھی نہیں جلاتا، کوئی کسی کے باپ کو اسکی آنکھوں کے آگے قتل بھی نہیں کرتا۔ کوئی کسی کے بہن بھائیوں کو آگ میں جھلسنے نہیں دیتا۔ مجھ سے یہ مت کہیں کہ میں ظالم ہوں۔ ابتدا آپ لوگوں نے کی تھی۔ میں نے کہانی کو انجام دیا ہے۔“ وہ انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے روانی سے بولا۔ ”آپ کی بیٹی میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی۔ میرے ہی بھائی کے ساتھ تعلقات رکھے اور آپ چاہتے تھے میں اسے معاف کر دوں؟ معذرت مگر عبداللہ بے وقوفوں کی صف سے نکل آیا ہے۔“

”یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ بشر بغیر لگی لپٹے کے پوچھ رہا تھا۔

”وہ جو میری ملکیت ہے۔ میری منگیتر۔ نہ وہ غیرت کے نام پہ قتل ہوئی ہے۔ نہ وہ کہیں غائب ہوئی ہے۔ وہ جہاں بھی ہے تم جانتے ہو۔ مجھے اسکا پتہ چاہیے۔ میں ماضی بھول جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔“

”تم وعدے نبھانے کے کچے ہو عبد اللہ۔“

”میں نے باپ کے قتل کے وقت وعدہ لیا تھا نوابوں پہ چین کی زندگی حرام کروں گا۔ آج تک نبھا رہا ہوں۔ تم پھر بھی مجھے الزام دے رہے ہو؟“ اسے تاسف ہوا۔ ”میرا سیاہ سفید میری منگیتر کے ساتھ تھا۔ تمہاری دوسری بہن کو چند گھنٹوں کے اندر واپس لایا تھا میں۔ تم اب بھی مجھ سے تعاون نہیں کرو گے؟“

”قبائلی تعلقات ختم عبد اللہ قانون تم بیچ میں لائے تھے اب انصاف اسی سے جا کر مانگو۔ میں تمہیں دعا دے سکتا ہوں کہ تم اسکی خاک تک بھی نہ پہنچ سکو۔ اور میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو۔“ اسی کے انداز میں کہتا وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ قیس نے پر امید نظروں سے حاتم کو دیکھا۔ وہ بھی اسی تنفر کے ساتھ اٹھ گئے تھے۔ عدالتی چکروں کے لئے اس شہر میں رہنا انکی مجبوری تھا۔ ورنہ اس وقت عبد اللہ انکے سامنے نہ ہوتا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ کئی لمحے وہاں بیٹھا رہا۔ ہر راہ مسدود تھی۔ ہر راستہ بند۔ اس کی محفوظ پناہ گاہ اسکی اپنی نگاہوں سے اتنی اوجھل کیسے ہو سکتی ہے؟ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”محببتوں میں دنیا تیاگ دینا قصے کہانیوں تک محدود ہے۔ موجودہ دور میں لاکھوں ضرورتیں ایسی ہیں جنہیں پورا کرنے کو محبتیں خاک کرنی پڑتی ہیں۔“

اسلام آباد ایئر پورٹ پہ معمول کا رش تھا۔ وہ اپنے ارد گرد دیکھے بغیر سیدھ میں چل رہا تھا جب آس پاس سے رپورٹرز کہیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اسکے ساتھ چلتے ہوئے گارڈز نے اسکے گرد پہرہ بنایا۔ قیس

نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں پیچھے ہٹنے کو کہا۔ اسکے آگے کئی مائیکس تھے۔ مختلف نیوز چینلز کے کیمراز تھے۔ سوال کرتی ہوئی کئی زبانیں تھیں۔ وہ سپاٹ نگاہوں سے چند پل انہیں دیکھتا رہا۔

”پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نااہلی کی وجہ سے آج ہمیں یہ دن دیکھنا پڑے گا کہ قاتلہ فرار ہوں گی اور مقتول کے خاندان کو بس صبر کرنا ہو گا۔“ وہ اب دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”اسلام آباد واپس آنا میری ضرورت ہے کیونکہ یہاں میرا خاندان ہے۔ لیکن میں اس شہر کو نہیں بھولوں گا جہاں سے میرے بھائی کے گناہگار فرار ہوئے۔ اگر کوئی بھی شخص اس لڑکی کو واپس لائے یا اسکی کوئی اطلاع لائے تو میں قیس کمبیر اسے منہ مانگی رقم دے سکتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بس کا اعلان کر چکا تھا۔

چند لمحے بعد گاڑی میں بیٹھے سڑک پہ نظریں جمائے اسے احساس ہوا یہ شہر، یہ سڑکیں، یہ ہوائیں سب ”اس“ کے بغیر بے کار تھیں۔ طیش کم ہو رہا تھا اور اسکی جگہ بے چینی بھر رہی تھی۔ ایسی بے چینی جو اسکے دل کو خاک کر سکتی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا اس نے کیا کر دیا ہے۔ افسوس مگر وقت واپسی کے مواقع بہت کم دیتا ہے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

ڈھا کہ بنگلہ دیش۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے اطراف میں دیکھ رہی تھی۔ اسکے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ جو کمرے کے ایک کونے میں رکھے صوفے پہ بیٹھے ہوئے مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اسکا چہرہ دھندلا تھا۔ آواز

مختلف سنائی دیتی تھی۔ وہ چند پل انہیں دیکھتی رہی پھر دماغ پہ بوجھ بڑھا، پلکیں بھاری ہوئیں اور ہر منظر ٹوٹ گیا۔ وہ غنودگی میں جا چکی تھی۔

اگلی بار اسکی ناک سوئی کی چھن کی وجہ سے کھلی تھی۔ اسکے پاس کھڑا کوئی اسے بازو میں سوئی لگا رہا تھا۔ پھر اس نے نیما کو اپنے بازو پہ روئی مسلتے ہوئے دیکھا۔ اسے اپنا ایک بازو بالکل مفلوج ہوتا محسوس ہوا۔ نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو اس بازو کی کلائیوں پہ پٹی بندھی تھی۔ دوسرے بازو پہ جلے کے داغ تھے۔ زینیا حاکم کے دونوں ہاتھ اگلے دن چند کے لئے کام نہیں کر سکتے تھے اس بیڈ پہ بیٹھے بیٹھے اسے اندازہ ہوا۔ تھکن، بے زاری اور بے کلی کے مارے اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ شاید رات کا کوئی پہر تھا۔ کھڑکی سے چاند کی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ساتھ والے گھر سے کسی بچے کے زور زور سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہی آوازیں اسکے سر پہ ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ وقت، تاریخ، دن وہ ہر شے کا حساب بھول گئی تھی۔ کئی لمحے وہ بستر پہ بیٹھی رہی۔ پھر جھک کر دیکھا تو بیڈ کی پائنٹی کے قریب نیما فرشی بستر پہ سو رہی تھی۔ آنکھیں پر سکون انداز میں بند تھیں۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”بھوک لگی ہے؟“ زینیا اسکی آواز پہ باقاعدہ چونک گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھی مگر جاگ رہی تھی۔ ”اگر لگی ہے تو جاؤ کچن سے کھانا لے آؤ۔ اور اگر شور سے جاگی ہو تو عادت ڈال لو۔“

”آج کیا تاریخ ہے؟“

”پندرہ فروری۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”تم پہ میرا قرض بیس ہزار ٹکا ہو گیا ہے۔“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ وہ تذبذب سے کہنے لگی۔

”تو جاؤ پکن سے کھانا لے آؤ، شور مت کرنا وجہہ ڈائن جاگ جائے گی۔“

لیکن میرے ہاتھ میں درد ہے۔“

”یہ تمہیں خود کشتی کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ یکدم کچھ یاد آنے پہ اٹھ بیٹھی۔ ”اگر واقعی مرنا تھا تو یقیناً تمہیں یہ تو علم ہو گا ہی کس نس کو کاٹنے سے انسان مر سکتا ہے؟“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ نیما اب کے خاموش رہی اور بازو لمبا کر کے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔ زینیا نے اپنی ٹانگوں سے چادر ہٹائی اور پیر فرش پہ رکھے۔ فرش ٹھنڈا تھا اسکی ہڈیوں تک میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ چند پل وہ پیر فرش پہ رکھے بیٹھی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چادر اچھے سے لپیٹی اور باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ لوٹی تو اسکے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے تھی۔ جسے اس نے پلنگ پہ رکھا خود بھی سامنے آکر بیٹھی۔ فرائنڈ مچھلی، چاول اور آلو کے قتلے آج شاید گھر میں کوئی دعوت تھی۔ وہ کئی دن کے بھوکوں کی طرح کھانے پہ ٹوٹ پڑی۔ اور جلدی جلدی نوالے لینے لگی۔

”ایک لڑکی کا بوجھ بہت بھاری ہوتا ہے۔“ ٹانگوں پہ چادر پھیلانے اسے دیکھتے ہوئے نیما کہنے لگی۔ ”رفیق نے وحید بھائی سے تمہاری ذمہ داری لینے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ تم ایک لڑکی ہو۔ لیکن میں نے تمہاری ذمہ داری لی۔ کیونکہ میں خود ایک عورت ہوں اور خود کو معاشرے پہ بوجھ نہیں سمجھتی۔“ اسکی اٹھی ہوئی گردن اسکا مان تھی۔ ”میرے ابا نے میری شادی ایک بڑے گھر میں کروائی تھی۔ روپیہ پیسہ، مال دولت اور شوہر کی محبت ہر شے تھی میرے پاس۔ اللہ اسے بخشے میرے شکیب جیسا مرد دوبارہ پیدا نہیں ہو گا۔“ اسکے لبوں پہ مغموم مسکراہٹ تھی۔ نوالہ زینیا کے حلق میں اٹک چکا تھا۔ ”وہ شادی کے تین سال بعد مر گیا۔ مجھ پہ بڑا کٹھن وقت آیا۔ سسرال کو بوجھ لگی انہوں نے گھر سے نکال دیا۔ بھائیوں کو بوجھ لگی تو

بغیر مجھ سے پوچھے میرا دوسرا نکاح طے کر دیا۔ ”زینیا کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ دوسرا؟ کوئی دوسرا کیسے؟

”میرا دوسرا شوہر اچھا آدمی نہیں تھا۔ میں بیوہ تھی معاشرے کا بوجھ۔ میں بانجھ تھی معاشرے کا بوجھ لیکن میں نے خود کو کبھی بوجھ نہیں سمجھا تھا۔“ زینیا کھانستے کھانستے دوہری ہونے لگی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ نیا کی آواز اسکی کھانسی کی آواز میں دب رہی تھی۔ ”اس نے جب مجھ پہ پہلی بار ہاتھ اٹھایا میں نے برداشت کیا۔ پھر دوسری بار، پھر تیسری۔ پھر ایک دن میں تھک گئی۔ شاید مجھے یاد آگیا تھا کہ ”مجھ پہ سب سے زیادہ حق میرا ہے۔“ وہ بیڈ سے اٹھی اور دیوانہ وار گرتے پڑتے کھڑکی کی طرف بڑھی جہاں پانی کا جگ رکھا تھا۔ ادھیڑ عمر بنگالی عورت نے اسکی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ کوئی کسی مدد نہیں کرتا۔

”میں نے طلاق لے لی۔ معاشرہ میرے بوجھ سے دب گیا۔ میرا خاندان ڈھے گیا۔ صرف ایک عورت نے آدھا معاشرہ کیسے شرمندہ کیا میں سمجھ نہیں سکی۔“ وہ کہہ کر ہنسنے لگی۔ زور زور سے قہقہے مار کر ہنسنے لگی۔ اسکے قہقہوں میں کرب تھا۔ مگر مان بھی۔ ”بھائیوں پہ میرا بوجھ بڑھ گیا۔ اور جب میں نے ان سے اپنا حصہ مانگا تب انہیں لگائیں دنیا کی سب سے خراب عورت ہوں۔ میں باغی ہوں۔ لیکن میں نہیں تھی مجھے معلوم تھا۔ عورت کو خود معلوم ہونا چاہیے وہ کیسی ہے۔ کیا ہے؟“ اس نے دو گلاس حلق میں اتارے۔ چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔ خاموش کمرے میں اب محض نیا کی آواز تھی۔ ”میرے دس سال ضائع ہو گئے زوہرا، یہ سمجھنے میں کہ گرنے پہ دنیا سہارا نہیں دیتی۔ تم کتنا وقت ضائع کرنا چاہتی ہو؟ یہ تم پہ منحصر ہے۔ اٹھنے کی قوت کو زنگ لگ جائے تو زندگی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔“

کھڑکی سے ٹیک لگائے وہ چپ چاپ وہیں بیٹھ گئی۔ دل میں بے اختیار کچھ کھب گیا تھا وہ یاد آنے لگا تھا جو کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ کیا وہ اسے کبھی بھول پائے گی؟ اس نے پینڈنٹ مٹھی میں دبوچ لیا۔ اس زندگی میں نہیں اور اس سے اگلی سات زندگیوں میں بھی نہیں۔

”میں نے خود کشی نہیں کی تھی۔“ کافی دیر بعد وہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ میرا دل کرتا ہے میں خود کو نقصان پہنچاؤں۔ مجھے لگتا ہے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ صرف مجھے۔ آپ نے فلمیں دیکھی ہیں؟“ گیلا چہرہ اٹھا کر نیا کی پشت کو دیکھا۔ ”وہاں کسی سین میں دکھایا جاتا ہے سب بھاگ رہا ہے۔ زندگی، دنیا، لوگ صرف ایک کردار کھڑا رہ جاتا ہے۔ اور مجھے وہ کردار میرا اپنا لگتا ہے۔“ اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ”میری دادی نے وصیت کی تھی کہ انہیں غسل دینے والی صرف تین عورتیں ہونی چاہیے۔ انکی زینہ، کوچ اور انکی بڑی بہو۔ جانے کس نے غسل دیا ہو گا؟ جانے کیا ہوا ہو گا؟ کیسی پوتی ہوں میں جو اپنی دادی کی آخری وصیت تک پوری نہیں کر سکی۔“ آنسو چہرے پہ پھسل رہے تھے۔ دل میں زخم تازہ ہوئے۔ ”مجھے لگتا ہے میرے اندر کچھ کمی ہے مجھے لگتا ہے وہ درست کہتا تھا۔ . . . عبد اللہ۔ میرے کردار کے متعلق درست کہتا تھا۔“

”تمہیں اپنے بارے میں کیا لگتا ہے یہ زیادہ اہم ہے۔“

”میری سوچیں جامد ہیں۔ میرے لئے زندگی میں کوئی اسپارکل باقی نہیں رہا۔ جو میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھے یہاں گھٹن ہوتی ہے۔ مجھے انکی زبان سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یہاں ایک چور جیسا محسوس ہوتا ہے۔“ اسکے گلے میں کچھ بھاری سا اٹکا۔ روح گھائل ہوئی۔ ”مجھے وہ یاد آتا ہے۔ اتار ہے گا۔ میں اسکی یاد کا کیا کروں؟ میں اسے بھول نہیں سکتی۔ میں کبھی اس سے موو آن نہیں کر پاؤں گی۔ وہ

دل میں تھا ہے اور رہے گا میں اس دل کو نہیں نکال سکتی۔ مہدی میری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ تھا میں اس حصے کو نکال دوں تو پیچھے سانسیں بچ جاتی ہیں زندگی نہیں۔“

”زندگی گزارنے کے لئے دل کے مشورے رد کرنے پڑتے ہیں ورنہ اس نے آج تک کس کی عزت کروائی ہے؟ دل حصہ ہمارے جسم کا ہے مگر ریاکاری میں دنیا کا ساتھی ہے۔ اسے دماغ پہ نہیں چڑھاتے زوہرا۔“

”یہ میرا نام نہیں ہے۔“ اس نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اس زندگی میں تمہارا نام یہی نام ہے۔“

”نہیں چاہیے مجھے یہ زندگی۔“

”تو پھر ختم کرو اسے۔“ تیما خشک انداز میں بولی۔ پھر اٹھ کر اسکے قریب پنچوں کے بل بیٹھی۔ ”یہاں ضرب لگاؤ۔“ اس نے زینیا کی زخمی کلائی اونچی کی، درد اٹھا، کراہ بلند ہوئی۔ ”سب ختم ہو جائے گا۔ درد، زندگی، دنیا، محبت۔ پھر سزا شروع ہوگی۔ ہر اس انسان کے لئے سزا متعین ہے جو زندگی اور موت کے درمیان کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ ساٹھ ستر سالہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ لیکن اسکے بعد جو شروع ہوگی وہاں کوئی اختتام نہیں۔“

وہ زور زور سے رونے لگی۔ کم از کم یہ کام وہ نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا بزدل کہتی تھی تو زینیا حاکم اس دنیا کی سب سے بڑی بزدل تھی۔ وہ اس زندگی سے بھاگ سکتی تھی، چھپ سکتی تھی اسے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اسے موت سوڈر لگتا تھا۔ اس کا واحد خوف۔

اسلام آباد کی ہواؤں میں انحراف کب شامل ہوا قیس کسیر کو علم ہی نہیں ہو سکا۔ آج بڑے دن بعد اس نے قیس میں قدم دھرے تھے۔ عمارت نے سینہ چوڑا کر لیا، آسمان سے چند قطرے ادھار مانگ کر آنسو بہائے، وقت اس پہ مہربان ہوا تھا کہ اس عمارت کے مالک نے اسے اپنی آمد بخشی تھی۔ لقمان (قیس کا نیا سیکریٹری) اسکے سامنے کچھ کاغذات رکھ رہا تھا۔ نئی تفصیلات دے رہا تھا۔ قیس سنتا رہا۔ اسکی جگہ حدیبیہ کو ہونا تھا، وہ یہاں کیا کر رہا ہے قیس کو پہلی دفع اسکی موجودگی کھلی۔ مگر اس نے ظاہر نہ کیا۔

نظر اٹھا کر صفحات کی طرف دیکھو تو وہاں ایک مردانہ کوٹ کا خاکہ تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ مکمل منہمک نظر آتا تھا۔ دل جل رہا تھا زندگی ایک ناکام سیریز بن گئی تھی لیکن ڈیزائنر صاحب کام نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

”جو اہر کا کام کہاں تک پہنچا؟ اپڈیٹس کہاں ہیں؟“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”سر کام pause ہو گیا تھا۔ مہدی سر کی ڈیبتھ کی وجہ سے۔“

قیس نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ نگاہوں میں تنبیہ تھی۔ ”بھائی میرا امر اتھا انکا باپ نہیں، پھر کام کیوں رکھا؟ میرے بھائی کے قتل کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا اور میں یہاں موجود ہوں اسکا مطلب یہ ہے کہ قیس امر ہے۔ کوئی موت اسے بند نہیں کروا سکتی، پھر کام کیسے رکھا؟“

”سر میں . . .“

”نوٹس جاری کرواؤ، آفس آؤرز میں اضافہ کرو۔ کسی کا باپ مارے یا ماں کا جنازہ اٹھے فرق نہیں پڑتا۔ اس ہفتے کے اختتام پہ کام مکمل چاہیے مجھے۔“

”شیور سر۔“ اس نے بغیر بحث کے تابعداری سے کہا۔ قیس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا مگر وہ رک گیا۔ ”ایک اور بات کہنی تھی۔“ قیس کا بھروسہ پانا اسکے لئے اہم ترین شے تھی۔ کسی بھی طرح اسے یہ چاہیے تھا۔ ”میرے پاس آپ کے لئے کچھ ہے۔“

”تم اسکے ذریعے بھی حبیب کی جگہ نہیں پاسکتے۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”میں اپنی جگہ بنانے آیا ہوں باس۔“

اس نے پنسل واپس کاغذ پہ رکھی اور محفوظ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یہاں کام کرنے سے پہلے تمہیں سب بتایا تھا میں کس طرح کا آدمی ہوں۔ ماہ جبین کی باتوں میں مت آنا صرف اسے ہی اچھا لگتا ہوں میں۔ باقی دنیا کو بڑے مسائل ہیں مجھ سے۔“

”وہ میری سابقہ باس تھیں اور آپ میرے حالیہ باس۔ میں صرف آپ کی بھلائی سوچ رہا ہوں سر۔ آپ کی پیٹھ پہ خنجر مارنے والوں کو نظر میں رکھوں گا۔“

”ساری دنیا نے تو اوقات دکھادی اب پیچھے کون رہ گیا ہے؟“ وہ ہنسا۔ ایک عجیب سی خالی ہنسی۔

”انیسہ بختیار کمبیر۔“ لقمان نے کہا اور وہ کرسی پہ بیٹھے ہوئے ساکت ہوا۔ لقمان نے چند تصاویر میز پہ رکھیں۔ ”انہوں نے نیویارک میں شادی کر لی ہے۔ لڑکا مسیح ہے۔ بختیار کمبیر یہ سب جانتے تھے

اور“ وہ سانس روکے ان تصاویر کو دیکھ رہا تھا جن میں وہ سفید لباس والی لڑکی سیاہ سوٹ والے

لڑکے کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”لڑکی اب حاملہ ہے باس۔“

سیاہ آنکھوں والے مرد کی ساری دنیا سرد ہو گئی۔ وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ کسی نے اسکے پیروں سے زمین کھینچ لی تھی۔

”لڑکے کے پاس امریکن نیشنلیٹی تھی اس لئے انیسہ بختیار اب ایک امریکن ہے۔ جب میں نے ان دونوں کے متعلق معلومات نکلوائیں تب بختیار صاحب کو پتہ چل گیا اور انہیں خدشہ تھا کہ آپ انکے خلاف کوئی کارروائی ضرور کریں گے اس لئے یہ . . .“ اس نے ایک خاکی لفافہ میز پر رکھا جس سے سفید کاغذ جفا کا پروانہ سنار ہے تھے۔ ایک اور ضرب جس نے قیس کی کمر توڑ دینی تھی۔ اس نے لمبی انگلیوں سے کاغذات باہر نکالے۔

”انہوں نے میڈیا کو آپ کے خلاف ثبوت دینے چاہے ہیں۔ وہ کمبیر صاحب کا قتل آپ کی طرف پھیر رہے ہیں اور اسے غیرت کے نام پر ہونے والے قتل کا نام دینا چاہ رہے ہیں۔ یہ کاغذات میں نے میڈیا تک جانے سے روک لئے ہیں لیکن . . . آپ کو کچھ کرنا ہو گا ورنہ چیزیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔“

اس نے ڈھیر سارا تھوک نگلیوں گویا زہر کا آخری گھونٹ نگلا۔ کوئی نیزہ تھا جو اسکے دل کے آر پار ہو گیا تھا۔ سیاہ آنکھوں کے پار رنگین مناظر تھے۔ وہ چھ سالہ بچی تھی جسے نو عمر قیس نے کندھوں پہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ کھکھلارہی تھی، اسکے کندھوں کو مضبوطی سے تھامے ہنس رہی تھی۔ اگلے منظر میں وہ اس ناراض بچی کو کھانا کھلا رہا تھا۔ اسکی آنسوؤں سے بھری آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ بچی بڑی ہو گئی تھی وہ اسکے گارجین کی حیثیت سے اسکے کالج کی تقریبات میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ اپنے گلے میں پڑا میڈل اسکے گلے میں ڈال رہی تھی اور وہ اسکی کامیابیوں پہ مسکرا رہا تھا۔

”آپ کیوں عورتوں کے کپڑے نہیں بناتے یار؟“ انیسہ اسکے کندھے کے پار سے اسکیچ بک دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”فکر نہ کرو، تمہاری شادی کے جوڑے کاڈیزائن میں ہی بناؤں گا۔“

”اگر نہیں بنایا تو میں شادی نہیں کروں گی۔“

”سر...“ وہ صور جیسی آواز اسے خیالوں سے کھینچ لائی۔ ”کبیر صاحب کے قتل کے بعد پاکستان نہ آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔“ لقمان مزید کہہ رہا تھا۔ قیس سنتا رہا۔ اسے نہ جانے کیوں مگر احساس ہو رہا تھا کہ اراضی کے جس قطعے پہ اس نے محل کھڑا کیا ہے وہ مٹی جفاکار تھی، کنکر غیروں کی صف میں، اور ستون بغاوت کے گیت گاتے ہوئے۔ یکلخت احساس ہوا اپنا ہر جذبہ اس نے غلط انسانوں پہ کیوں لگا دیا؟

”تم جاؤ لقمان۔ تمہارا کام ختم ہوا۔“ بہت دیر بعد وہ بھاری لہجے میں بولا۔ لقمان سر ہلاتا ہوا پلٹ گیا۔ قیس ایک بار پھر اپنے بنائے ہوئے ڈیزائن پہ پنسل سے بچا ہوا کام کرنے لگا۔ اسکی انگلیاں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ مگر وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسکی رنگت نچڑ گئی تھی مگر کام نہیں رکا۔

شام کے سائے ڈھل گئے آفس کے گھنٹے ختم ہوئے تب وہ باہر نکل آیا۔ شو فرنے گاڑی نکالی۔ قیس عقبی نشست پہ بیٹھا اور گاڑی کبیر محل کی طرف روانہ ہوئی۔ کچھ وقت بعد دوسری منزل پہ واقع ایک کمرے کے دروازے میں چابی گھسار ہا تھا۔ دروازہ کھل گیا، اندھیرے میں ڈوبے اس کمرے میں واحد روشنی وہ تھی جو دروازہ کھلنے پہ باہر سے آئی تھی۔ اندر گھپ اندھیرے میں وہیل چیئر پہ بیٹھے آدمی نے آنکھیں چندھیا لیں۔ قیس پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چھوٹے چھوٹے قدم لیتا آگے آیا۔ آدمی کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ اسکا سارا وجود روشنی، اور اسکے اسیر کا سارا وجود گھپ اندھیرا۔

”مجھے یاد کیا ہو گاناں؟“

”تم نے زینیا کے ساتھ کیا کیا ہے؟ کتنا وقت گزر گیا ہے، کہاں ہے وہ؟“ مقصود کمبیر کی آواز میں آج بھی بلا کی سختی تھی۔

قیس نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے بھی نہیں پتہ وہ کہاں ہے۔ میں بھی بس ڈھونڈ رہا ہوں۔ یقین کریں بہت مس کر رہا ہوں اسے۔ اسکے ہونے سے سب تھا۔ وہ نہیں ہے تو . . . کچھ مسنگ ہے۔“

”تمہیں شرم آنی چاہیے تم نے اپنے بھائی کو مار دیا؟“

”میں نے نہیں مارا۔“ اس نے ترنت مقصود کی بات کاٹی۔ پھر انکی آنکھوں میں دیکھا۔ اور بے حد سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ ”میں نے بس بچایا نہیں۔“ اسے یاد تھا بہت اچھی طرح یاد تھا کس طرح کچھ لوگوں نے اسکے سامنے اسکے بھائی کو منظر سے غائب کیا اسے سب یاد تھا۔ ہاں وہ آگ، وہ شور اور موت اسکا ٹراماٹر گر کر چکی تھی مگر بہر حال وہ بعد میں بھی اس کے بارے میں پولیس کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اسکی مرضی۔

”اس نے مجھے بہت ہرٹ کیا تھا۔ اس نے ہر وہ حد پار کی جہاں جہاں میں نرم پڑ سکتا تھا۔ زینیا حاکم میری ریڈ لائن ہے۔ بات اس پہ آجائے تو اعمال اور نتائج کی فکر نہیں کرتا میں۔ اسکے لہجے اور چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔

”اور اسی لڑکی کو عدالتوں کے چکر میں رسوا کیا تم نے۔“

”عزت بھی میں ہی دوں گا۔“ مصنوعی روشنی اسکے اندر کی سیاہی کو چھپانے میں ناکام رہی۔ ”سزا کے بعد اسے واپس مجھ تک آنا ہے۔ ہمارے درمیان مسائل تھے، ہیں اور رہیں گے آپ کی اور میری بات کر لیتے ہیں۔ انیسہ کے نکاح کے متعلق جانتے تھے آپ؟“

مقصود خاموش رہے۔ گلے میں گلی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ چہرے کا رنگ ایک پل کو تبدیل ہوا۔ ”اور اگر جانتے تھے تو مجھ سے مخفی رکھنے کی ایک وجہ بتادیں۔“

”تمہیں اس کے متعلق بتادیتا تو وہ اور اس کا باپ تمہیں زمینیا اور مہدی کے نکاح کے متعلق بتادیتے۔“

قیس کے دل کو دھکا لگا تھا۔ یعنی وہ سب لوگ جانتے تھے، یعنی بس وہی لا علم رہا؟ ”کیا کرو گے تم اب؟ کیا کر سکتے ہو؟ مارنا چاہتے ہو مارو مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے۔“ خوف تھا، موت کا بے حد خوف تھا مگر مقصود کمبیر کو دو سو فیصد یقین تھا خاندان کی موت قیس کمبیر کے لئے آج بھی ٹراما ہیں اور رہیں گی۔ وہ سب کر سکتا ہے لیکن اپنے خاندان میں کسی کو مار نہیں سکتا۔ انہیں دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آج کل کس راہداری سے کونسی چھت اسکے اوپر گرے وہ اثر نہیں لیتا تھا۔

”جہاں چھوڑا ہے یہیں سے سلسلہ شروع کریں گے۔ اوکے؟ فلحال آپ آرام کریں۔“ وہ باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ کمبیر محل کی ہر دوسری تیسری دیوار پہ اس محل کے مکینوں کی تصاویر تھیں۔ آج پہلی بار اس نے رک کر ایک بھی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ آج تابوت میں آخری کیل ٹھونکا جا چکا تھا۔ آج قیس کمبیر سارے کا سارا مسخ ہو گیا تھا۔

سفید کمرے میں آج پہلی بار کوئی رنگ مہمان بنا تھا۔ وہ قرمزی رنگ تھا۔ محبت جیسا قرمزی۔ جفاؤں جیسا قرمزی۔ اسی قرمزی سیال بڑی مقدار میں بہتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی شدید درد تھا جس سے اسے نیند سے جگا دیا تھا۔ کئی لمحے وہ خالی الذہنی کے عالم میں یونہی اوندھے منہ پڑا رہا اور پھر اسے احساس ہوا وہ کیا کر چکا

ہے۔ تیزی سے اٹھ کر بیٹھنے پہ اسے معلوم ہوا یہ خون اسکے سینے سے رس رہا تھا۔ اور یہ درد، کیوں ہر گزرتے لمحے شدید ہو رہا تھا۔ مہدی کمبیر پہ ساتوں آسمان ایک ساتھ ٹوٹ کر گرے تھے۔ اسکے زخم پر اپر ٹریمنٹ نہ ملنے کی وجہ سوا بھی کچے تھے۔ سونے پہ سہاگاہہ حسب عادت اوندھے منہ لیٹ گیا تھا اور اب وہی ہوا جس کا زرقون کو ڈر لگا رہتا تھا اسکے زخم ادھڑ چکے تھے اور ان سے کثیر تعداد میں خون رس رہا تھا۔ اسکا سارالباس سرخ ہو گیا تھا۔ ایک ہتھیلی بھی خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

اسے رونا چاہیے تھا۔ درد سے کراہنا چاہیے اس خون سے ڈرنا چاہیے تھا مگر وہ ساکت نگاہوں سے خون کی اس ندی کو دیکھ رہا تھا۔ خون کا وہ تالاب سمٹا گیا یہاں تک کہ اسکی جگہ ایک تنگ پیندے والے برتن نے لے لی جس کے اندر سرخ مشروب تھا۔ گلاس کے باہر پانی کے قطرے جمع تھے جو مشروب کے بخ ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ اور اگر گلاس سے ذرا نظر اٹھا کر اوپر دیکھو تو سنہری آنکھوں والی لڑکی کے ماتھے پہ لکیروں کا جال تھا۔

”اب مجھ سے یہ مت کہئے گا کہ آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں۔ ٹھیک ہے ماضی برا تھا لیکن اب موو آن کریں ناں۔ کیوں خود کو کسی کے ہاتھوں بے عزت کروانا۔“

”بے عزت کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟“ اسکے سامنے بیٹھا مرد مسکرا کر بولا۔ لڑکی نے آنکھیں گھمائیں۔ ”اوکے مان لیا جو ہوا وہ ہم دونوں کے ساتھ equally غلط تھا۔ لیکن تم میری حالت نہیں سمجھ سکتیں۔ میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا جو میری فیملی ہیں۔“

”فیملی وہ ہوتی ہے جو ہر فرد کو برابر رکھے ایک شاہ اور دوسرا گدا کیوں؟“

”ایک منٹ کہیں تمہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہوئی؟ جب سے تمہیں یہ پتہ چلا کہ میں تمہارے ظالم سابقہ منگیتر کے جال سے تمہیں بچا لیا؟“ وہ دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھے آگے ہوا۔ ”کبھی سوچا ہے میرے جیسا مرد کیسے مل گیا تمہیں؟“

”جی سوچا ہے اور مجھے پتہ چل گیا جس دن میرا آپ سے نکاح ہوا تھا اس دن میں نشے میں تھی۔“

”میری محبت کا نشہ؟“ وہ اسی انداز میں بولا۔

”شٹ اپ۔“

”جو حکم سرکار۔“

”مہدی میں سیر نہیں ہوں۔“

”میرا نام اتنا اچھا ہے یا تم سے سن کر لگ رہا ہے۔“ وہ اپنے سابقہ شوخ انداز میں بولا۔

اس نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ مہدی کو دیکھا۔ وہ جو تپانے والی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا یکدم بے مزہ ہوا۔ ”اب ایسے موڈ خراب کر دو گی تو میرا کیا ہو گا؟ پہلے ہی اپنی زندگی کے اس پلاٹ ٹوئسٹ کے بعد میری یادداشت بڑی مشکل سے جگہ پہ آئی ہے۔“

”میں چاہتی ہوں آپ جو چیزیں اسٹیج پہ کھڑے ہو کر بولتے ہیں انہیں اپنی زندگی پہ اپلائی کریں۔“

”میں کوشش کروں گا، میں نے کی تھی۔ ہار گیا۔ اب دوبارہ کروں گا اوکے؟“

گلاس غائب ہوا، وقت کے چکر بد لے اور سفید قید خانے میں وہ اپنے خون سے سرخ ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رنگ تھا چاہے اسکے جسم سے نکلا تھا چاہے جسم کو چیر کر نکلا تھا لیکن یہ رنگ تھا اس سفید قید خانے

میں یہ واحد رنگ تھا۔ اس نے دھیرے سے انگلی کے پوروں پہ اس خون کو چھوا۔ اور آنکھوں کے قریب کیا۔ اسکی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ رنگ دھندلا ہوا مگر اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں اور ایک بار پھر اس رنگ کو دیکھنے لگا۔ گلے میں ایک گولہ سا ٹکا تھا۔ اسکا دماغ حال سے منقطع ہونے لگا۔

”اچھا بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ وہ اسکے خفا چہرے کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”میں کچھ نہیں چاہتی۔ آپ نے مجھ سے مشورہ مانگا اور جب میں نے دیاتب آپ نے اسے مذاق میں اڑایا۔ مجھے آپ کی کاؤنسلنگ کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”اچھا ناں بتاؤ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”میں نے کہا بھاڑ میں جائیں۔“ اس نے کہتے ہوئے اپنی کتاب چہرے کے آگے کر لی۔ مہدی نے کرسی ہاتھ میں اٹھائی اور اسکے دائیں طرف آکر بیٹھ گیا۔ معصومیت سے اسے دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو آگیا۔

”اور کوئی حکم سرکار؟“

زینیا حاکم نے سلگ کر اسے دیکھا۔ کچھ دن قبل تک جب وہ سچائی سے لاعلم تھا اپنے کمرے میں کھڑا رہا تھا تب اس کے لئے برا لگا تھا لیکن اس مہدی کا سر پھاڑنے کا دل کیا تھا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔ مہدی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب زینیا ہلکی آواز میں بولی۔

”لوگوں کا کارپٹ وہ بتا ہے جو اپنے اصل سے بھاگتا ہے۔ آپ بھاگ رہے ہیں۔ حالانکہ آپ اس ریس میں تھک چکے ہیں۔ وہ آپ کی فیملی ہے ٹھیک ہے لیکن ہر فیملی اس قابل نہیں ہوتی کہ انکی طرف سے ہر برا رویہ برداشت کیا جائے۔ دنیا کو سمجھنا ہو گا کہ ہر فیملی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ گلاس پہ انگلی پھیرتے ہوئے ایک پل کے لئے چپ ہو گئی۔ ”میں نے ایک عرصہ خود کو کھڑا کئے رکھا کیونکہ مجھے لگا تھا یہی میرا اصل

ہے لیکن نہیں۔ یہ غلط تھا۔ فیملی کے لئے بھی اتنا ہی کرنا چاہتا جتنی آپ کی استطاعت ہے۔ ورنہ انسان گر کر ٹوٹ جاتا ہے، اور ہر فیملی ایسی نہیں ہوتی کہ گرے ہوؤں کو اٹھائے۔“

”اور شروعات کہاں سے کروں؟ جہاں سے کی تھی وہاں تو میں بری طرح ٹوٹ کر گرا۔“ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب قیس ہسپتال میں تھا۔

”اپنی ذات سے۔“ اس نے پلٹ کر مہدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رنگ اپنی ذات میں ڈھونڈیں دنیا میں نہیں۔ جتنا انسان خود سے بھاگتا ہے دنیا اسے اتنا پیچھے چھوڑ کر آتی ہے۔ یہ آنکھیں“ اس نے مہدی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”دنیا کی سب سے خوبصورت آنکھیں ہیں۔“

”میں اسے تمہارا اظہار محبت سمجھوں؟“ وہ زیر لب مسکرایا۔ کیا تھا اس عورت میں، وہ جو لفظوں کے سحر سے لوگوں کو باندھ لیتا تھا وہ اس عورت کے سامنے مرید تھا۔ جو وہ کہے، سر تسلیم خم، انا قربان، ذہانت ایک طرف، دل تابعدار۔

”اپنی آنکھوں سے نفرت کرنا چھوڑ دیں یہ محض ایک رنگ ہے۔ یہ آپ کو آؤٹ کاسٹ نہیں بناتا۔ میری حفاظت کی فکر چھوڑ دیں۔ قیس کیا آدمی دنیا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ آپ اپنی حفاظت کریں۔ آپ نہیں کریں گے تو کوئی نہیں کرے گا۔“

”تم بھی نہیں؟ ایک ناکام سی کوشش ہی کر لینا۔ میرا دل خوش ہو جائے گا۔“

زینیا نے موبائل کھولا۔ مہدی بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ اب مہدی کا انسٹاگرام اکاؤنٹ بلاک کر رہی تھی۔ وہ مزید زور سے ہنسا۔ فیسبک، واٹس ایپ اور نمبر سے اسے بلاک کرنے کے بعد اس نے کرسی کو چھوڑ دیا۔

”مجھے زندگی سے کیسے بلاک کریں گی سرکار؟ ایسا تو کوئی آپشن ہی نہیں آتا۔“

”سائنس ترقی کر رہی ہے، جلد ایسا آپشن آجائے گا۔“

”ایسی سائنس کو آگ لگا دوں گا میں۔“

وہ اسکے سرخ تپے ہوئے چہرے کو دیکھ مزید تپا گیا۔ وہ خوبصورت لگتی تھی جب مسکراتی تھی لیکن مہدی کو وہ تب زینیا حاکم لگتی تھی جب اسکا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا تھا۔

اسکا چہرہ غائب ہوا اور ایک اور مہدی کمبیر اس رنگین منظر سے ایک بار پھر اس سفید کمرے میں واپس آیا۔ خون اب بھی رس رہا تھا۔ اور درد بڑھتا جا رہا تھا۔ ”زر قون“ وہ یونہی خون دیکھتے ہوئے چلایا۔ ”زر قون . . . میرے زخم کھل گئے ہیں . . . کہاں ہو تم؟“

کئی میل دور اسلام کی ایک اونچی عمارت کے سیکورٹی روم میں کھڑے براق کے آگے سکریز تھیں اور ان سکریز پہ وہی منظر تھا۔ سفید کمرے، سرخ خون اور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت لئے مہدی کمبیر۔ اس نے کانوں پہ لگے اسپیکر کے ساتھ رابطہ جوڑا۔ دوسری جانب کنٹینرز میں کپڑے رکھواتے زر قون کے کانوں میں اسکے الفاظ پڑے تو وہ چونکا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”میرا دوست تکلیف میں ہے زر قون۔ تم اسکا خیال نہیں رکھ رہے۔“

”میں مصروف تھا باس، ابھی دیکھ لیتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے قدم اندر کی طرف لینے لگا۔ اگلے چند منٹ میں وہ اس سفید کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اندر آکر ایک لمحے کے وہ خود بھی جامد ہوا۔ فرش پہ جا بجا سرخ خون تھا۔ زر قون جس طرح آیا تھا اسی تیزی سے دروازہ بند کرتا باہر گیا۔ اگلی بار اسکے ساتھ دو لوگ بھی آئے تھے۔ خون سے پیر بچاتے، وہ تینوں لوگ اب اسے لٹا رہے تھے کسی نے اسکے جسم پہ موجود سفید لباس اتارا۔ مہدی نے اپنا خون سے سرخ سینہ دیکھا، وہ بھوری رنگت اس قید خانے کا دوسرا رنگ

تھا۔ اسے جسم پہ کوئی مانع گرایا گیا، کوئی پٹی باندھی گئی، ٹانگے لگائے گئے۔ ہر کام اسکے ہوش میں ہوتے ہوئے کیا گیا۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اسے ایک نیا سفید لباس دیا گیا۔ وہ جیسے کچھ سوچ اور دیکھ نہیں رہا تھا۔

”یہ سب صاف کرو یہاں سے۔“ زر قون نے خون کی جانب اشارہ کرتے ناگواری سے کہا۔

”اسے رہنے دو پلیز اسے مت ہٹاؤ پلیز۔“ زخمی مرد تیزی سے بولا۔

کانوں میں اسپیکر لگائے کھڑے براق نے اس منظر کو دیکھتے ہوئے آنکھیں چھوٹی کیں۔ وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا؟

”اگر زیادہ ضرورت ہے تو ٹانگے کھول دیتا ہوں مزید خون نکل جانے دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ زر قون نے اسکے بالوں سے پکڑ کر اسکا چہرہ اونچا کیا۔ مہدی کے لہجے میں اسکی آنکھوں کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

”پلیز... اپنے باس سے کہو پلیز۔“ وہ منت کرنے کے انداز میں بولا۔

”قیس سے کہو اسے یہیں رہنے دے پلیز۔“

زر قون کی آنکھوں میں کچھ ابھرا تھا۔ پبلک اسپیکر کی سبز زیرک آنکھوں نے فوراً اس تاثر کو پہچانا۔ اور دل ہی دل مسکرایا۔ اوہ گاڈ یہ تو بس ایک انسان تھا، محض ایک انسان۔ وہ اتنے دن ان انسانوں سے ڈرتا رہا؟ وہ انسان جو ایک تاثر تک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ وہ انسان جن کا چہرہ ہر شے کی گواہی دے دیتا ہے۔ وہ ان انسانوں سے ڈرتا رہا تھا؟

”وہ جو چاہتا ہے اسے کرنے دو۔“ کان کے آلے میں براق حنیف کی آواز ابھری۔ زر قون دھیرے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسکے انداز میں کچھ غیر آرام دہ سا تھا۔ جیسے مہدی کمبیر کی اداکاری کو بھانپ گیا ہو۔

”کیا تم مجھے ایک آئینہ دے سکتے ہو؟“ اسے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ مہدی نے پکارا۔ زر قون پلٹا۔ نگاہوں میں شک کی مقدار بڑھ گئی۔

”کیا کرو گے آئینے کا؟ اسے توڑ کر خود کشی؟“

اس نے نفی میں سر ہلا۔ ”میں اپنی آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے یہ نہیں کہا کہ میں خود کو بتانا چاہتا ہوں مہدی کو لوگ ڈراتے نہیں فیسینیٹ کرتے ہیں۔ اسے اب یہ بتانا چاہیے تھا۔

Safar-e-Adab

ڈی آئی جی آفس سے نکلتے ہوئے اسکے ماتھے پہ بلوں کا جال تھا۔ چہرہ اچھا خاصا بے زار اور وہ خود کسی حد تک تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اپنی چھوٹی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے گھر سے کال موصول ہوئی۔

”بھائی آپ کب تک گھر آئیں گے؟ ہم کھانے پہ انتظار کریں۔“ دوسری طرف اسکا چھوٹا بھائی تھا۔

”نہیں جو مرغ مسلم بنا ہے وہ سالم اپنے پیٹ میں اتار لو۔ میرا انتظار کرنے کی زحمت مت کرو۔“ تنک کر کہتے ہوئے اس نے گیسر بدلا۔

”لیکن ہم نے مرغ مسلم بنایا ہی نہیں۔“ دوسری جانب کسی کو فکر لاحق ہوئی۔

”میرے باپ جو بھی بنا ہے چپ چاپ کھالے اور کھا کر سو جا۔ میرا دماغ خراب کرنا بند کر دے۔“ وریام بیگ نے کال کاٹ دی۔ گاڑی سڑک پہ ڈالتے ہوئے اب وہ ڈیش بورڈ سے چھوٹا سا موبائل نکال کر آن کر رہا تھا۔ کچھ وقت بعد وہ ملاقات کا وقت اور جگہ طے کر چکا تھا۔ اتنے دنوں میں پہلی بار اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسکی نوکری بھی جاسکتی ہے۔ انکو اڑی جس انداز سے شروع ہوئی تھی وریام کے لئے جیسے زندان خانہ کھل گیا ہو۔ وہ آج بھی بڑی ہی مشکل سے جواب دے کر آیا تھا۔

اگلی بار جہاں گاڑی رکی وہ ایک مصروف سی شاہراہ تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف کیفے، ریستورانز، کافی شاپس، آئس کریم پارلرز تھے۔ وہ پچھلی سیٹ پہ پڑا مفلر اٹھا کر چہرے اور گردن کے گرد باندھتا باہر نکل آیا۔ کیفے کی کونے والی میز پہ اسکی مہمان بیٹھی تھی۔ خاکی رنگ کے اوور کوٹ کے ساتھ سیاہ پینٹ اور بال پشت پہ کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ وریام اسکے سامنے آکر بیٹھا۔ انداز غیر آرامدہ اور چوکنا تھا۔

”اگلی بار ہم کسی پبلک پلیس پہ نہیں ملیں گے۔“ وہ وارن کرنے کے انداز میں بولا۔

”پھر؟ تمہارے ساتھ کسی خالی کوٹھی اور فیکٹری جانا ہو گا۔“ شینزل تپ گئی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”تم مفر ٹیبل ہو تو شیور۔“

”مجھے کیوں بلایا ہے؟“ اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ وریام کے سر پہ لگی تلوں پہ بجھی۔ اسکا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”جب مجھے کالز کر کر کے میرا مستقبل خطرے میں ڈال رہی تھیں تب سوچا تھا ایسا کیوں کر رہی ہو؟ مجھے اندازہ ہو رہا ہے یہ نوکری میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے مجھے صاف صاف بتاؤ تمہارے ایکس کا اس سب سے کیا تعلق ہے۔ تاکہ یہ مسٹری جلد از جلد ختم ہو۔“

”تمہیں کس نے کہا یہ سب“ وہ ایک لمحے کو رک کی۔ حلق ترکیا۔ ”براق نے کیا ہے۔“

وریام نے بغور اسکے تاثرات جانچے۔ اسکی سیاہ آنکھوں میں ڈوبتی افسردگی دیکھی اور پھر اسے کسی کی آنکھوں کی چمک یاد آئی۔ اس کھلے احاطے والے کیفے سے پرے اسے سلاخیں یاد آئیں اور ان سلاخوں کے پار کھڑی سنہری آنکھوں والی لڑکی۔

”قیس نے مہدی کا قتل نہیں کیا۔ اس نے یہ سب کچھ اپنے حق میں استعمال کیا ہے۔“ وہ وریام سے کہہ رہی تھی۔ ”براق، قیس اور مہدی تینوں دوست ہیں۔ براق نے ایک دوبار مجھے اور مہدی کو ساتھ دیکھا تھا اور وہ ہمارے نکاح کے متعلق بھی جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے جاننے کی کوشش کی۔ اور انہی دنوں اسکی اور شیرل کی شادی تھی۔ لیکن اسکے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات تھے۔“ وہ سانس لینے کو رک کی۔ ”براق کی شادی والے روز بھی وہ کسی اور عورت کے ساتھ تھا اور قیس نے تصاویر لے لی تھیں۔ اس سے چند دن قبل بھی وہ انہی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا۔ اور مہدی کے پاس اسکی تصاویر بھی تھیں۔“

”کافی رنگین مزاج آدمی ہے یہ براق۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”جب اسے پتہ چلا قیس نے اسے تصاویر بھیجی ہیں تب اس نے بہت فساد پھیلایا تھا۔ لیکن اسے مہدی کے متعلق نہیں پتہ تھا۔ اب شاید پتہ لگ گیا ہو اور . . .“

”کم آن۔“ وہ بے زاری سے پیچھے ہوا۔ ”براق قیسم ٹیکسٹائل کا سب سے بڑا انویسٹر ہے۔ کم از کم ایک لڑکی کے لئے وہ یہ سب نہیں کر سکتا۔ اتنا بڑا کاروبار وہ اس طرح ایک لڑکی کے لئے گھائے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”اسکی ماں عرب تھی۔ اور اسکا باپ پاکستانی۔ لیکن کوئی نہیں جانتا وہ کون تھا۔“ اب یہ خبر قابل غور تھی۔

وریام سیدھا ہو بیٹھا۔ ”اب میں براق کا باپ ڈھونڈنے نکل جاؤں؟“

”لنک ڈھونڈنے۔“ زینیا نے تصحیح کی۔ ”ایسے قتل یو نہی بیٹھے بیٹھے پلان نہیں ہوتے۔ تم شیزل سے ملو۔ وہ تمہاری مدد کرے گی۔ وہ براق کو اسکے اسکول کے زمانے سے جانتی ہے۔“

”میں براق کو اسکے اسکول کے زمانے سے جانتی ہوں۔“ وہ گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وریام حال میں واپس آچکا تھا۔ ”لیکن اس نے اپنے خاندان کے بارے میں زیادہ کچھ بتایا نہیں تھا۔ اسکی ممی کا قتل ہوا تھا گھر میں ڈاکو گھس آئی تھے شاید۔ لیکن rumors تھے کہ اسکی ممی کو براق کے والد کے خاندان نے قتل کروایا تھا۔ کیونکہ وہ اپنا حصہ چاہتی تھیں۔ یہ اسکول کے بعد کا قصہ ہے تب تو میری جاب بھی ہو گئی تھی اور قسیم بھی بن گیا تھا۔“

”تمہاری جرات کو سلام ہے کہ تم پھر بھی ایسے قاتل خاندان کی اکلوتی بہو بننے پہ راضی ہو گئیں۔“

”میری برداشت کو بھی سلام کرو جو میں اس وقت تمہارے منہ سے زہر نکلتا ہوا سن رہی ہوں پھر بھی خاموش ہوں۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”شاید اس لیے کیونکہ تمہارے زہر کی فیکٹری میں مائع کی کمی ہو گئی ہے۔“

”یا تو تم مجھ سے کام کروالو یا پھر زبان کے جوہر دکھالو۔“ وہ بازو سینے پہ باندھ کر سنجیدہ نظر آتی تھی۔ وریام نے اسے دیکھا اور کام نکلوانے کا سوچا۔

”دیکھو مس شیزل۔ تم اسے بچپن سے جانتی ہو۔ اس طرح تم اسکے دوستوں کو بھی جانتی ہو گی۔ تمہارے اور اسکے میوچیول دوست بھی ہوں گے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں اگر براق نے یہ قتل کیا تو کیوں؟ اور اسکے لئے یہ جاننا ضروری ہے اسکا خاندان کون تھا۔“

”میں پتہ کرواتا ہوں۔ لیکن مجھ سے زیادہ کنکشنز تمہارے ہوں گے۔ براق کی ماں سعودیہ سے پاکستان آئی تھیں۔ ان دنوں میں وہ کس سے ملتی تھیں یہ پتہ کروانا اتنا مشکل تو نہیں ہوگا۔“

”لسٹ بہت لمبی ہے۔ بیٹا ماں پہ ہی گیا ہے۔“ وریام بڑبڑایا۔ شیزل چپ چاپ اپنی سابقہ ساس کے قصے سنتی رہی۔

”میں قیس سے مل کر پتہ کرواؤں گی۔ انکار نہیں کرے گا وہ۔“

”بڑی گہری دوستی ہے؟“ طنزیہ لہجہ۔ ”اسے اس سب میں انوالو مت کرو۔ میں نے براق سے ملنے والوں کا پتہ کروایا ہے۔ وہاں سے ایک تصویر ملی ہے اگر تم اسے جانتی ہو تو۔۔“ اس نے موبائل کھول کر ایک تصویر شیزل کو دکھائی۔ شیزل اپنی جگہ سے تھوڑا سا آگے کو ہوئی۔

”یہ تو ریحان ہے۔ براق کے بچپن کا دوست۔ لیکن اسکی فیملی وغیرہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے آس پاس ایک نگاہ ڈالی پھر تھوڑا سا آگے کو ہوئی۔ ”جدی پشتی اسمگلرز ہیں۔ آج کل ریحان ہی سب سنبھال رہا ہے۔ اسلحے کی غیر قانونی اسمگلنگ ان پہ ختم ہے۔ اسکے تعلقات بھی پورے ملک میں ہیں۔“ اچھنبے سے کہتے ہوئے وہ رکی۔ ”لیکن براق اور اسکی ملاقاتیں عام نہیں ہوتیں۔ دو بدن ایک جان ہیں یہ۔“

وریام کا دل سارے میں پہلی بار ہلکا ہوا۔ ”مل گیا کلیو یعنی براق کہیں نہ کہیں اس سب میں شامل ضرور ہے۔ کیونکہ یہ آدمی آج کل کچھ زیادہ ہی قریب رہتا ہے اسکے۔“

”تم تو پولیس میں ریحان کے بارے میں کیسے نہیں جانتے؟“

”میں اسکے متعلق سب جانتا ہوں اسکا اور براق کا تعلق جانتا تھا۔ کیونکہ ریحان یو نہی کسی کی مدد نہیں کرتا۔“

شینزل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ ”براق، ریحان اور وقار تین دوست ہو ا کرتے تھے۔“ وریام بری طرح چونکا۔ ”وقار احمد نام تھا۔ شاید۔“

”وقار احمد آفندی؟“

”مجھے سر نیم نہیں یاد۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ وریام نے موبائل پہ انگلیاں چلاتے ہوئے تیزی سے ایک تصویر کھولی اور اسکے آگے کی۔

”اسے دیکھو، یہ وہی وقار ہے کیا؟“ پولیس وردی میں ملبوس وقار تصویر میں مسکرا رہا تھا۔

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا۔“ شینزل نے غور سے اسکا چہرہ دیکھا۔ ”ایک منٹ۔“ اس نے اپنا موبائل نکال کر وریام کے موبائل کی سکرین کی تصویر لی اور واٹس ایپ پہ کسی کو بھیجی۔ ساتھ ایک واٹس نوٹ بھیجا۔ ”اسکو دیکھو یہ وہی ہے ناں جو ہمارے ساتھ اسکول میں تھا۔ براق اور ریحان کا دوست۔ اسکا سر نیم آفندی ہے کیا؟“

میج بھیج کر وہ جواب کا انتظار کرنے لگی۔ وریام کو اپنے بدترین شبہات سچ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی پل میج ٹیون بجی۔

”وہی ہے۔ دو مہینے پہلے اسکی شادی ہوئی تھی ناں؟ اور ہاں اسکا سر نیم آفندی ہے۔“

وریام کے لبوں سے ایک سرد آہ خارج ہوئی۔ اسکے دل کے خدشے وہم نہیں تھے۔ موبائل اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے وہ اٹھا تھا۔ ”اگلی بار کب اور کہاں ملنا ہے میں بتا دوں گا۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ باہر جاتے ہوئے اسکا چہرہ پر سوچ تھا۔

”کراچی پاکستان۔“

عالم نواب کے اس ٹرپل سٹوری گھر میں سکوت قائم تھا۔ اوپر چھت پہ لکڑی کے اسٹول پہ بشر حاکم بیٹھا تھا۔ اسکی دائیں طرف ضیغم اور عین سامنے حاکم نواب بیٹھے تھے۔ بیٹے کو غور سے دیکھتے ہوئے۔ کئی دنوں کے عدالتی چکر اور تھانے کی خوار یوں کے بعد وہ بلاخر اس سے وہ سوال کر رہے تھے جو انہیں بے چین کئے ہوئے تھا۔

”زینی کہاں ہے بشر؟“

بار بار کسی نمبر کو ڈائل کرتے بشر کی انگلیاں تھم گئیں۔ اس نے گلابی پڑتی آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔ ”یہ سوال کرنے کا حق کھو چکے ہیں آپ۔ جب اسے پٹنے اور مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا تو اب اسے بھول جائیں۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

”میں اسے سزا نہ دیتا تو یہیں کھڑے کھڑے مار دیتے اسے۔ میں نے اسے بچایا ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔“

”آپ بھی نہیں سمجھیں گے ابا۔“ بشر چیخ پڑا۔ اتنے دنوں کی فرسٹریشن حلق سے باہر آئی۔ ”میں اسے کیسے، کس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ وحید صاحب کے فون نہیں لگ رہے۔ پتہ نہیں وہ اس شہر کے کونسے حصے میں کس حالت میں ہوگی مجھے کچھ نہیں پتہ۔“ وہ میری بہن ہے اور میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ اس سے بڑی تکلیف کیا ہے؟ آپ سمجھ سکتے ہیں مجھے؟“

”پھر بھیجا کیوں تھا؟“ مدھم لہجے اور مستحکم انداز میں پوچھنے والا ضیغم میر تھا۔

”شاید تم اندھے تھے ورنہ تمہیں نظر آجاتا کہ میں نے اسے اسکی حفاظت کے لئے بھیجا تھا۔“

”حفاظت قریب رکھ کر کی جاتی ہے۔ گھر کی بہو بیٹی کو گھر کے کے باہر نکالنا حفاظت نہیں ہوتی۔ اگر تم اتنے دلیر اور غیرت مند تھے تو اسے اپنی نظروں سے نہ دور کرتے سچ یہی ہے کہ تم اسکی وجہ سے شرمندہ تھے لیکن تمہارے دل میں اس کے لئے محبت بھی تھی اس لئے تم نے اسے دور بھیج دیا۔ اور اب بھگتو۔“

”تم ہمارے گھر کے معاملات سے دور رہا کرو۔“ وہ بھر گیا۔

”اسی کیس میں مجھ پہ دوا ایف آئی آر ہیں اس لحاظ سے یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ اور اس گھر سوے بھی میرے بڑے تعلقات ہیں۔ یاد دلو اوں۔“ وہ دونوں آپس میں بھڑپڑے تھے۔ جب حاکم نے حتمی لہجے میں رائے دی۔

”ہم ابھی وحید سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس نے زینی کو کہاں کس جگہ رکھا ہے اتنا تو بتا ہی سکتا ہے۔“

بشر نے گہری سانس لی۔ اور اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ”اب یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے اس سے صرف میرا تعلق ہے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے اس سے۔ میری بہن سے دور رہیں۔“

”مت بھولو میں تمہارا باپ ہوں۔ جس اونچے لہجے میں تم مجھ سے بات کر رہے ہو حلق سے زبان کھینچ سکتا ہوں تمہاری۔“ وہ چیخے چلائے نہیں بس سپاٹ انداز میں تنبیہ کی۔

بشر نے اگلے الفاظ اپنے منہ میں ہی روک لئے۔ ضیغم کو اشارہ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ حاکم کے لئے واضح اشارہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہے۔ گاڑی کراچی کی سڑکوں پہ رواں دواں تھی۔ وہ غلطی سے بھی

پورٹ کی طرف نہیں گیا اور ان سمنز سے تو کال بلکل نہیں کی جو اسکے نام پہ رجسٹرڈ تھیں۔ ایک عام سا شہری بیٹھے بیٹھے کر منل ہو گیا تھا۔

گاڑی جہاں رکی وہ لیاری کا علاقہ تھا۔ لیاری ٹیلنٹ کا گڑھ ہے۔ اصل کراچی، اور کراچی کا اصل۔ یہاں کے لوگ کئی دہائیوں سے اس علاقے میں مقیم ہیں۔ لہجہ، رکھ رکھاؤ آج بھی وہی جیسا کوئی نصف صدی قبل۔ لیاری قدرے خستہ حال ہے۔ ایسی ہی خستہ حال گلیوں کو پار کرتے ایک چھوٹے سے ڈھابے کی طرف آؤ تو وہاں سفید داڑھی والا وحید اللہ اپنے سامنے بیٹھے کسی آدمی سے مسکراتے ہوئے بات کر رہا تھا۔ بشر نے احتیاطاً اپنے آس پاس دیکھا۔ جب تسلی ہو گئی وہاں کوئی مشکوک انسان نہیں ہے تب وہ وحید کے سامنے چلا آیا۔ اور انکے سامنے آکر بیٹھا۔

”کیسے ہو بچہ؟“ انہوں نے بشر کا کندھا تھپکتے ہوئے پوچھا۔

”ایک بھائی جس کی بہن در بدر ہو رہی ہو وہ کیسا ہو سکتا ہے؟“

”اختر چار کٹنگ لاؤ۔“ وحید نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکے نے سر ہلا دیا۔ پھر بشر کو دیکھا۔ ”وہ بلکل ٹھیک ہے۔ اسکا زخم بھی بہتر ہو رہا ہے۔ تم اسکی فکر مت کرو۔“

بشر کے دل کو تقویت ملی تھی۔ ”مجھے اس سے ملنا ہے۔ یا بس میری بات کروادیں۔ اسکی فکر کرنا چھوڑ نہیں سکتا۔“

ضیغم اس سارے وقت میں خاموش رہا تھا۔ اسے کچھ کھٹک رہا تھا۔ یوں جیسے ابھی کچھ ہونے والا تھا۔

”لیکن تم اس سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو؟ تم نے اسے میرے حوالے کیا تھا۔ اسکی حفاظت اب میرے ذمے ہے۔“ لڑکے نے چالا کر رکھی۔ بشر کچھ سمجھ نہیں سکا۔ لڑکا چلا گیا تو وحید نے انہی نرم نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ زینیا حاکم نہیں رہی وہ زوہرا متین ہے اب اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اب میرا ذمہ ہے۔“ بشر کو یوں لگا تھا جیسے انہوں نے کوئی مذاق کیا ہو۔ اسکی رنگت تبدیل ہونے لگی۔

”میری بہن ہے وہ نام بدل لینے سے اسکی پہچان نہیں بدل جائے گی۔ اور آپ آپ مجھے ڈبل کر اس نہیں کر سکتے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے چلایا۔

”اور اگر میں کر دوں تو؟“

”میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ غرایا۔ اسکی آنکھیں غیر انسانی تھیں۔ وہ پاگل ہونے کے درپے تھا۔ ”وہ میری بہن ہے آپ ایسے کیسے اسے کہیں بھیج سکتے ہیں۔ مجھے ابھی کے ابھی جاننا ہے وہ کہاں ہے۔ مجھے وہ واپس چاہیے میں نے صرف ابا کے کہنے پہ آپ پہ بھروسہ کیا تھا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ بس وحید اللہ کا ایک اشارہ، اور بشر حاکم یہاں سے اپنے قدموں پہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ مگر وہ مرد بے حد تحمل کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔ اسکے چہرے پہ غصے اور طیش کا شائبہ تک نہیں تھا۔

”دیکھیں میری بات سنیں۔ آپ سمجھ نہیں رہے۔ اگر آپ کو پیسہ چاہیے میں پیسہ دے سکتا ہوں۔ آپ کو کچھ اور چاہیے میں سب دے سکتا ہوں لیکن وہ بہن ہے میری آپ اس طرح اسے غائب نہیں کر سکتے۔ وہ جہاں بھی ہے آج نہیں توکل مجھے اسکے پاس جانا ہے۔“

”تم یہ چاہتے ہو، تم وہ چاہتے ہو لیکن تم نے یہ سوچا ہے وہ کیا چاہتی ہے؟ اب وہ تم سب سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتی جانتے ہو کیوں؟“ وہ آگے کو ہوئے بشر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”کیونکہ وہ کہتی ہے غیرت مند بھائی بہنوں کی حفاظت کرنے کے لئے انہیں گھر کے باہر نہیں کھڑا کرتے اور جو کر دیں وہ غیرت مند نہیں ہوتے۔ وہ باپ، باپ نہیں ہوتے جو اپنی بیٹیوں کی حفاظت نہ کر سکیں۔“

بشر دھیرے سے واپس بیٹھ گیا۔ ”میرا طریقہ غلط ہو سکتا ہے نیت نہیں۔ آپ میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے میں نے آپ پہ بھروسہ کیا تھا۔“ اس کے پاس دلیلوں کی قلت پڑ گئی۔

”اول تو تم نے مجھ پہ نہیں اپنے باپ پہ بھروسہ کیا تھا اور دوئم اگر تم نے مجھ پہ بھی بھروسہ کیا تھا تو صرف اس بات کا کہ میں اسے ایک محفوظ مقام پہ لے آؤں گا۔ میں لے آیا۔ اب تم مجھ سے گلا نہیں کر سکتے۔ تمہاری اپنی بہن کو تم پہ کوئی اعتبار نہیں ہے۔“

بشر کئی لمحے دم سادھے انہیں دیکھے گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

”آپ میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے، زینی میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتی۔“ اس کی آواز اس کی اپنی نہیں لگتی تھی۔ پھر یکدم اس میں طیش اتر آیا۔ ”میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا آپ میری بہن کو ایسے کیسے غائب کر سکتے ہیں۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا آپ کو۔“ وہ غرانے لگا تھا۔ جو نہی اس نے وحید اللہ کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا کئی لوگوں نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

”یہ آدمی دوبارہ لیاری میں نظر نہیں آنا چاہیے۔“ انہوں نے حکم صادر کیا۔ اور لوگ اسے گھسیٹ کر لے کر جا رہے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا چلا رہا تھا۔ شاید رو بھی رہا تھا۔ بشر حاکم زندہ درگور کیا جا چکا تھا۔ وہ پولیس میں

نہیں جاسکتا تھا وہ اپنے مضبوط خاندان کو اس سب میں انوالو نہیں کر سکتا تھا وہ اب کس غیرت سے کس منہ سے اپنے باپ کو غلط کہے گا؟

اسے گھسیٹ کر کب گاڑی میں لا کر پھینکا گیا۔ کب گاڑی چلی اور کب وہ گھر واپس آیا ہر شے سلوموشن میں ہوئی تھی۔ کچھ بھی پراسیس کرنا سکے بس میں نہیں تھا۔ گھر آنے پہ جو پہلا چہرہ اس نے دیکھا وہ حاکم نواب کا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ بشر کی نگاہیں جھک گئیں۔ سینے کی جلن کا قصہ پھر سہی۔

”کیسی ہے وہ؟“ تین حرفی سوال۔ بشر نثر مساری سے گردن تک نہ اٹھا سکا۔

”زندہ لیکن ہمارے لئے مر گئی۔ آپ دونوں کی غیرت نے اسے مار دیا ہے۔“ ضنیغ نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ صحن میں اب دومر درہ گئے۔ دونوں کے دلوں میں پچھتاوے ہی پچھتاوے رہ گئے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خالی ہاتھ تھے۔

Safar-e-Adab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”آپ اس سفر کے لئے ایکسائٹڈ تو ہیں نا؟“ اسلام آباد کی سڑکوں پہ قیس کمبیر کی سیاہ رتنج روور کے اندر جھانک کر دیکھو تو وہ پچھلی نشست پہ بیٹھے مقصود کمبیر سے پوچھ رہا تھا۔ اگلی نشست پہ ایزل بیٹھی ہوئی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مجھے مارنا تھا تو تم یہ کام گھر پہ بھی کر سکتے تھے۔“ انہیں میرہ سے سخت اختلاف تھے مگر اسکی بیٹی کے ذہن پہ کوئی برا اثر پڑے یہ وہ نہیں چاہتے تھے اس لئے بلوچی زبان میں کہا۔

”جانتے تو ہیں آپ مار نہیں سکتا آپ کو۔ بلکہ اپنے پورے خاندان کو نہیں۔ موت سے ڈر لگتا ہے مجھے۔“ اس نے اپنے تئیں بڑے پتے کی بات بتائی۔ پھر اگلی نشست پہ گلابی فراک میں ملبوس بالوں کی دو چٹیا بنا کر بیٹھی ایزل کو دیکھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے ہی جھک کر اسکے گال چومے۔ بچی کھکھلاتی۔

”میں نے تمہیں ایک گیم کا بتایا تھا ناں؟ اب اس میں انکل کی سزا شروع۔“ اب کے اس نے ایزل سے کہا۔

”میں تمہاری کسی سزا سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ جانتا ہوں خود نہیں مارو گے تو کسی سے مروادو گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا عبد اللہ وقت کروٹ لیتا ہے اور پھر ہر فرعون اسکی کروٹ تلے دب جاتا ہے۔“

”میں کیا کروں پھر؟ جب آپ سب لوگ مل کر مجھے ہرٹ کریں گے تو مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ دنیا کیا سمجھے گی، کمزور مرد ہے اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں جاسکتا۔“ اس نے ٹریفک کی وجہ سے گاڑی روک دی۔ پیچھے مڑ کر مقصود کو دیکھا۔ ”آپ بتائیں کیا میرے پاس کوئی آپشن ہے۔ کسی ملازم کی طرح آپ کے کھانے، دوا، صحت کا خیال رکھا۔ معذور تھے آپ لیکن ساتھ رکھا۔ آپ نے بدلے میں کیا دیا؟ اس سبز آنکھوں والے کو فیورز؟“

”اس سے ہماری نفرت مشترک ہے۔ میں نے جو کچھ کیا زینیا کے لئے کیا اور اگر دوبارہ موقع ملا تو دوبارہ یہی کروں گا۔“

زینیا کے نام پہ قیس کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ پٹھوں میں کھنچاؤ اتر۔ دل میں کہیں ابال اور درد ایک ساتھ اٹھے۔ وہ کہاں اور کیسی ہوگی، بے اختیار اس ایک سوال نے اسے کہاں سے کہاں لاکھڑا کیا؟

”اس نے میری ایفرٹس کی قدر نہیں کی پھر آپ کس خوش فہمی میں ہیں؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”وہ کہاں ہے عبد اللہ؟ تم نے اسے کہاں بھیجا ہے؟“

”یہ سوال میرا دل روز مجھ سے کرتا ہے۔ جواب کہیں سے نہیں آ رہا۔ اسے دنیا نے مجھ سے دور کر دیا ہے“ اسے سوچ کر ہی تکلیف ہوئی۔ مقصود نے جواب میں کچھ کہا قیس خاموش رہا۔

اس نے ایک پرانی مگر مضبوط عمارت کے سامنے گاڑی روکی۔ اور اپنی طرف سے اتر آیا۔ اسکے پیچھے اسکے گارڈز کی گاڑی رکی اور اس سے تین چار لوگ برق رفتاری سے نیچے اترے، مقصود کسیر کو گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اتار کر وہیل چیئر پہ بٹھایا۔ جسے اب قیس تھام رہا تھا۔ وہ یونہی انکی وہیل چیئر تھامے اندر داخل ہوا۔ اسکے لئے دروازے وا کئے گئے۔ ایزل انکی دائیں طرف چل رہی تھی۔

مقصود چپ چاپ اپنے اطراف میں دیکھ رہے تھے۔ انکی عمر کے بلکہ ان سے زیادہ ضعیف مرد و عورتیں آس پاس اسٹک کے سہارے، چلتے نظر آ رہے تھے۔ انکی آنکھیں انتظار میں ڈوبی تھیں۔ چہرے مفلس حال۔

”عبد اللہ“ مقصود نے متوقع خوف کے پیش نظر اسے پکارا۔ وہ انہیں نہیں سن رہا تھا۔

”بادشاہت کا شوق تھا ناں آپ کو؟ ہر معاملے میں آپ کو اپنے فیصلے صادر کرنے کے شوق تھے۔“

”عبد اللہ میں عبد اللہ . . .“ انکے برف چہرے پہ تاثر تھے۔ خوف کے تاثر۔

”بہت سمجھایا تھا آپ کو بادشاہ میں ہوں۔ فیصلے مرے ہوں گے۔ یہ میرا محل ہے لیکن آپ کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔“

”عبد اللہ یہ مت کرنا یہ مت کرنا میں“

”میں نہیں مار سکتا اپنے خاندان کو یہ سچ ہے۔ میں زندہ رہنے رہنے جیسا بھی نہیں چھوڑوں گا یہ آپ بھول گئے تھے۔“

”تم مجھے مار دو عبد اللہ یہ مت کرنا مجھے مار دو۔“

”آج سے آپ یہیں رہیں گے جہاں آپ کا کوئی حکم نہیں چلے گا۔ کوئی بادشاہت نہیں، آج سے آپ بھی ایک غلام، ایک قابل ترس انسان کی زندگی گزاریں گے۔ سوچا ہے کبھی وہ لاکھوں روپے کے لباس، جوتے، دوائی، کھانے ان سب کے بغیر کیسے رہیں گے آپ؟“

”عبد اللہ نہیں“ انکی آنکھیں نم ہوئیں تھیں۔ ”یہ نہیں کرو پلیز مجھے مار دو میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“

گھاس کے اس وسیع قطعے پہ اپنی طرف چل کر آتی عورت کو دیکھ وہ مسکرایا۔ وہ قریب آ کر رکی۔ قیس ہنوز مسکراتا رہا۔ ”میں انہیں آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ غلط نہیں کر رہا ہے نا؟“

”بلکل نہیں۔“ عورت مسکرائی۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں کمبیر صاحب آگے کا کام ہمارا ہے۔“

قیس نے سر کو خم دیا اور ایک نظر مقصود پہ ڈالی۔ وہ ابھی تک نفی میں سر ہلا رہے تھے انکا چہرہ گیلا تھا۔ آنکھیں خوف زدہ۔ ”آپ یہی ڈیزرو کرتے تھے۔“ دھیرے سے کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ وہ اسے عقب سے پکار رہے تھے۔ واسطے دے رہے تھے۔ خود کو مار دینے کی درخواست کر رہے تھے مگر وہ کان لپیٹے جا رہا تھا۔ کسی آواز سے اسے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ آواز جو اسکے لئے رزق جیسی تھی اسے دور کرنے کے لئے اتنا حساب تو بنتا تھا۔ انکی چیخ و پکار پہ کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ یہاں تو آئے روز ایسا ہوتا تھا کوئی نہ کوئی اپنے بوڑھے والدین کو یہاں لا کر چھوڑ جایا کرتا تھا۔

واپس گاڑی تک آتے ہوئے اسکا چہرہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے ایزل سے کچھ بھی کہے بغیر گاڑی سٹارٹ کی۔ کئی سڑکیں ٹاپ کر، کئی شاہراہیں عبور کرتے ہوئے اب جہاں گاڑی نے اپنے چلتے ٹائرز کو راحت دی وہ مقام ایئر پورٹ کا تھا۔ وہاں ڈھیر سارے لوگ تھے۔ قیس نے ڈیش بورڈ پہ پڑی پی کیپ اٹھا کر ماتھے پہ درست کی۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا ناں ممی کی سزا شروع ہو گئی ہے؟“ ایزل کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ اس نے سر ہلادیا۔ ”اب تم اس گیم میں میری طرف سے warrior ہو۔ اوکے؟ میں تمہیں کہیں بھیجوں گا اور پھر کچھ وقت بعد لے آؤں گا لیکن میں جب تک نہ آؤں تم وہیں رہو گی۔“

”کیونکہ میں آپ کی warrior ہوں؟“ سبز آنکھوں والی بچی نے اشتیاق سے پوچھا۔ قیس نے سر کو اثبات میں ہلادیا۔ قیس گاڑی سے اتر آیا۔ پھر ایزل کی طرف سے آکر دروازہ کھولا اور اسے گود میں بھر لیا۔ چند پل بعد وہ احاطے کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔ جہاں سامنے محب مالک کھڑا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی خوش شکل چہرہ، وہی غرور و تمکنت۔ چہرے پہ وہی کر خنکی۔

قیس اسکے قریب آکر رکا۔ محب نے تیزی سے ایزل کو اس سے لینا چاہا اسکے انداز میں تڑپ تھی۔ ”میری بیٹی . . میری بچی۔“

”اگر اسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچی میں تمہارے سارے خاندان کو تباہ کر سکتا ہوں۔“

”وہ میری بیٹی ہے میں اسے تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے ایک بار پھر ایزل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ پیچھے ہو کر قیس کی گردن میں منہ چھپا گئی۔ اسکی کالر پہ ایزل کے ننھے ہاتھ کپکپا رہے

تھے۔ قیس کے دل پہ کوئی خنجر چل گیا۔ اس نے ایزل کو نیچے اتارا اور خود گھٹنوں کے بل اسکے قریب آ کر بیٹھا۔

”تم warrior ہو۔ تم یہ کر سکتی ہو۔ بس کچھ دن کے لئے تمہیں ڈیڈی کے پاس رہنا ہو گا اوکے؟“

”مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔“ بچی نے دھیرے سے کہا۔ اسکی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

”میں تمہیں بچانے آ جاؤں گا۔ جب تم چاہو گی تب اوکے؟“ اس نے ایزل کو قریب کر کے اسے گلے سے لگایا۔ ”میں تمہارے لئے ہر دفع آ جاؤں گا۔ اوکے؟“

گوکہ ایزل کی تشفی نہیں ہوئی مگر اس نے رندھی ہوئی آواز میں ”اوکے“ کہا تھا۔ قیس کئی لمحے اسے سینے میں بھینچے کھڑا رہا۔ اسکے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ بچی اس پہ اعتبار کرتی تھی۔ وہ یہ صلہ دے رہا تھا؟ بچوں کو تو جنگ میں بھی بخش دیا جاتا تھا یہ کیسا انتقام تھا جس میں صحیح غلط سب پس منظر میں چلا گیا تھا۔

”ہمیں نکلنا ہو گا قیس۔“ محب کی آواز پہ اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ ایزل کو خود سے الگ کیا۔ ہاتھ سے اسکے بال ٹھیک کئے۔ پھر اسکے رخساروں پہ بوسہ دیا۔ اور اسکا ہاتھ چھوڑ دیا۔ یہ ہاتھ چھوڑنا اسکے دل سے سانس کے ساتھ چھوڑنے جیسا تھا۔ پھر وہ اس سے الگ ہوا۔ محب نے جھک کر ایزل کو اٹھا لیا۔ اور قیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جسے قیس نے نہیں تھاما۔ وہ بچی کو لئے پلٹ رہا تھا بچی بار بار مڑ مڑ کر اسے تک رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں امید سی تھی جو ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ قیس کو اپنا دل خالی ہوتا محسوس ہوا۔ کیا وہ کبھی اسے دوبارہ دیکھ پائے گا؟ کیا اس نے بہت غلط کر دیا؟

تھوڑی دیر بعد اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ ان میڈیکل رپورٹس کو دیکھ رہا تھا جو محب نے اپنے سوشل میڈیا پہ اپلوڈ کی تھیں۔ جن میں واضح تھا کہ میرہ ذہنی امراض کی شکار رہی ہے۔ یہ ان دنوں ہوا تھا جب وہ دوسری دفع کنسیو کرنے لگی تھی مگر کوئی نہیں جاننا چاہتا تھا کیوں؟

ساتھ ایک ویڈیو تھی جس میں میرہ بری طرح ایزل پہ چیخ چلا رہی تھی۔ یہ مہدی کے قتل کے دن کی ویڈیو تھی۔ وہ پریشان اور ڈپرےسڈ تھی۔ آخر میں چند تصاویر تھیں جن میں ایزل محب کے ساتھ خوش تھی۔ یہ سب فراہم اور وائرل کرنے والا قیس کمبیر ہی تھا۔ محب اب ایک ہیرو تھا۔ جو اپنی بیٹی کو بچا کر اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ وہ اسکے ساتھ جانے پہ رضامند تھی۔ سوشل میڈیا اسکا طرف دار تھا۔

کورٹ کچہری کے چکر دیکھے جانے تھے فلحال جو ہو رہا تھا وہ ایک ماں کی بربادی تھی۔ گاڑی کی عقبی نشست پہ بیٹھا قیس کمبیر صرف ایک ہی سطر دہرا رہا تھا۔

”جو مجھے ہرٹ کرے گا، میں اسے ہرٹ کروں گا۔ یہی اصول تھا، ہے اور رہے گا۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

مغرب باسی ہو چکی تھی۔ آسمان پہ نارنجی روشنی اب سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ وہ چھوٹے سے اسٹول پہ بیٹھی دور خلاؤں میں دیکھ رہی۔ نہ اس شہر میں دل نہ لگنا تھا نہ لگ رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن گھر کے اس ایک کمرے میں بند رہتی۔ وجہ یہ اور اسکے بچوں کا شور و غل سنتی رہتی۔ رات میں جب نیا آتی تب وہ اسکے ساتھ چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ نیا بولتی رہتی۔ کبھی غصے سے اسے جھڑکتی، کبھی نرمی سے سمجھاتی، اور کبھی اسکا ہاتھ

پکڑ کر کھینچ کر لاتی اور چھت پہ بند کر دیتی۔ شروع شروع میں وہ ڈرتی تھی۔ اب وہ عادی ہونے لگی تھی۔ وہ اب ساری بحث کے دوران یہ انتظار کرتی کہ کب نیا اسے چھت پہ بند کرے گی؟

نیا ایک یا ڈیڑھ دن سے زیادہ اسے بند نہیں رکھ سکتی تھی۔ اتنا زینیا جان گئی تھی۔ اور اب ڈھٹائی کا عالم یہ تھا کہ اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ محض دن گن رہی تھی جس دن وحید واپس بنگلہ دیش آئے گا وہ اسی دن وہ واپس پاکستان جائے گی۔ وہ دونوں اس وقت چھت پہ موجود تھیں۔

”کیسا دکھتا تھا وہ؟“ بالٹی سے کپڑے نکالتی نیا نے اسے مخاطب کیا۔ زینیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”خوبصورت تھا؟“

”میرے لئے خوبصورت ہے۔“

”تھا۔“ نیا نے تمسخرانہ انداز میں اسکی تصحیح کی اور کپڑے نچوڑ کر تار پہ ڈالے۔ زینیا نے بغیر جواب دیئے رخ پھیر لیا۔ ”کیسا تھا تمہارے ساتھ؟ پیار و غیرہ کرتا تھا؟“

”وہ میرے ساتھ نرمی رکھتا تھا۔“ بڑے دنوں بعد اسکی افسردہ آنکھیں میں کچھ در آیا تھا۔ ”میری آنکھیں دیکھ کر اسے سب سمجھ آ جاتا تھا۔ وہ ساتھ ہوتا تھا تو ڈھارس ہوتی تھی۔ وہ میرا دل ہلکا کر دیتا تھا۔ ہو اسے بھی ہلکا۔ میں اسے سنتی تھی تو میرے دل پہ مرہم لگتا تھا۔ بس ایسا تھا وہ۔ پیارا اگر ایسا ہوتا ہے تو مہدی کمبیر دنیا میں سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتا تھا۔“

نیا نے جھک کر ایک اور کرتا اٹھایا اسے اچھی طرح نچوڑا اور تار پہ ڈالا۔ ”تم پیار کرتی تھی اس سے؟“ اس سوال پہ اسکی اداس آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتری۔

”محبت، پیار، عشق بہت چھوٹے لفظ ہیں۔ جو میں اسکے لئے محسوس کرتی ہوں وہ بے حد معتبر ہے۔“ اس نے گردن اٹھا کر سیاہی کی چادر اوڑھتے آسمان کو نکا۔ ”دنیا نہیں سمجھ سکتی وہ میرے لئے کیا ہے۔ دنیا میرے لئے میدان جنگ تھی وہ، وہ امن کی طرح ہے۔ ساری زندگی میرے قریبی مرد میرے لئے تپتی دھوپ رہے۔ مہدی میرا سائبان ہے۔“

”اسے تمہارے لئے کیا خواہش تھی؟ کیا چاہتا تھا وہ تمہارے لئے؟“ وہ جیسے اس خیال سے چونکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پہ سیاہی گہری ہوئی، ستاروں کے اٹے ہوئے تھال سے کئی ہزار ستارے آسمان پہ سج گئے۔ چھت غائب ہوئی، پیروں تلے سرمئی سڑک آگئی، جس کے اطراف میں سٹریٹ پولز تھے، لہلہاتے درخت تھے۔ اور سڑک کی ایک طرف تیز تیز قدم لیتی زینیا حاکم تھی۔

”تم اس طرح مجھ سے ناراض ہو کر جاؤ گی تو کیا فائدہ؟ میں تمہارے لئے صرف ایک چیز کی خواہش رکھتا ہوں زینیا۔“ وہ اسکے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ اس رات کا ذکر ہے جس دن زینیا کے پیروں پہ قیس کے گرائے ہوئے کیمرے کا زخم لگا تھا۔ یہ وہی دن تھا جب پہلی بار زینیا حاکم کا دل مہدی کے لئے مختلف کروٹ لے گیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں تم ایک آنریبل زندگی گزارو۔ جس میں تمہاری گردن اٹھی ہوئی ہو۔ جس میں لوگوں کو تم سے رویوں کے مسائل نہ ہوں۔ جن میں تم پہ پرت نہ چڑھی ہو۔ میں تمہیں ”پیور“ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ زخمی نگاہیں لئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سٹریٹ پول کے عین نیچے کھڑا تھا۔ فکر مندی سے اسے دیکھتا ہوا۔

”آپ اور میں کوئی نہیں ہیں ناں؟ میں وہ لڑکی نہیں ہوں جس کے ساتھ آپ کو رہنا پڑے گا پھر میرے لئے کیوں سوچ رہے ہیں آپ؟“

وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ بے وقوف لگتا یہ بتاتے ہوئے کہ تین بار قبول ہے کہہ کر وہ اس لڑکی کے سحر میں جکڑا جا چکا تھا۔ کیا بتاتا کہ اگر ساری دنیا کو آگ لگ رہی ہوگی تو وہ بچاؤ کے سامان بس اسکے لئے پیدا کرے گا؟ ہاں وہ ایسا سوچتا تھا لیکن اگر یہ محبت ہے تو اسے محبت سے خوف آتا تھا۔

”تم کیوں چاہتی تھیں میں اپنی اور اپنے مقام کی عزت کروں؟“

”یہ میری خواہش نہیں تھی۔ آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا جس کا جواب میں نے دے دیا تھا اسے مانیں یا نہ مانیں یہ آپ پہ منحصر ہے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ ساتھ موبائل پہ بٹن دباتے ہوئے کوئی رائیڈ بک کرنے لگی۔

”ٹھیک ہے پھر تم بھی اسے میری خواہش سمجھ لو۔ سن لو پھر عمل کرو یا نہ کرو۔“

”سن لی، سمجھ لی اور نہیں عمل کرنا اب یہ آپ بھی سن لیں۔“ متفرد انداز میں کہتی وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ مہدی نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابی کو دیکھا۔ دوسری نظر اسے جو اس کا ضبط آزما رہی تھی۔ گہری سانس بھرتا وہ اسکے پیچھے چل دیا۔ گاڑی کی خیر ہے ناراض بیوی منانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔

ذرا آگے جا کر اسکی رائیڈ آگئی تھی مگر اس میں پچھلی نشست پہ پہلے ہی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ مہدی نے زینیا کے کندھے کے پار اسے دیکھا اور سلگ ہی تو اٹھا۔ ”گاڑی کھڑی ہے ناں؟ اس میں بیٹھنا فرض تو نہیں ہے؟“

”میں تو بہت بد تمیز ہوں ناں؟ آپ کی گاڑی آپ کو مبارک۔ آپ آگے جا کر بیٹھ سکتے ہیں سر؟“ پہلی بات مہدی سے دوسری اندر بیٹھے آدمی سے کہی۔

”آپ بھی تو آگے بیٹھ سکتی ہیں۔“

”لیکن وہ اپنے شوہر کے بغیر بیٹھنا نہیں چاہتیں۔“ زینیا کو کندھے سے ہٹاتے وہ آگے آیا۔ ”میرے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہیں وہ۔“ یا پھر وہ انکے ساتھ بیٹھنا چاہتے ہیں؟

”پھر آپ دونوں محبت کی یہ مثالیں کہیں دور جا کر کھڑی کریں۔ چلو ڈرائیور۔“ بد مزاج آدمی نہایت بد مزاجی سے بولا اور ڈرائیور نے اس کے کہنے پہ گاڑی آگے بڑھادی۔ زینیا لب بھینچے اس گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”اچھی لڑکیاں اپنے شوہروں کے ساتھ آتی جاتی ہیں۔“ گاڑی کو جاتے دیکھ مہدی نے اسے بتایا۔ ”تم صرف اپنے شوہر کی گاڑی میں بیٹھتی ہوئی اچھی لگتی ہو کسی اور گاڑی میں بیٹھو گی تو شاید میں اسے آگ لگا دوں۔“ (اتنے تم پھنے خان) زینیا تک ہی تو اٹھی۔ بغیر اسکی طرف دیکھے وہ آگے بڑھ گئی۔ مہدی اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ زینیا مزید غصہ ہو رہی تھی، مگر اس کا رخ پارکنگ ہی کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے وہ شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ساتھ اس نے چند نوٹ نکال کر اسکی گود میں رکھے۔ مہدی نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ مورخ لکھے گا وہ پہلی عورت تھی جو اپنے شوہر کو غصے میں کسی بھی ایفرٹ کے پیسے پکڑا دیتی تھی۔ وہ ہنوز باہر دیکھتی رہی جب مہدی بہت محبت سے اور دھیرے سے بولا۔

”تمہارے متعلق میری خواہش ہے کہ تم ایک آنریبل زندگی گزارو۔“

”اور تم اسکی خواہش کو یوں روند دو گی؟“ اسلام آباد کی سڑکیں، اس شخص کا ساتھ، اسکی آواز، اسکی خوشبو ہر شے ایک لمحے میں غائب ہوئی۔ اب سامنے وہ نہیں تھا نیا تھی۔ جس نے دیوار کے ساتھ پشت جوڑ رکھی

تھی اور نگاہیں زمینیا پہ جمی تھیں۔ ”لوگوں کے ساتھ ہو جاتا ہے برا۔ زندگی کبھی کبھی فیئر ٹرائلز نہیں کھیلتی اسکا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس طرح خود کو برباد کرو؟ میں زیادہ وقت تمہارا یہ رویہ کہاں برداشت کروں گی؟“ وہ بالٹی اٹھا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ”تمہارے پاس چند دن ہیں تم“ اس نے ابھی پہلے زینے پہ ہی قدم رکھا تھا جب زمینیا نے دروازہ خود ہی بند کر دیا۔ نیماششدر رہ گئی۔

”اس سے زیادہ کیا کر لیں گی؟ سزا دینی ہے میں یہیں ہوں۔“

وہ چند لمحے وہیں کھڑی لب بھینچے اس دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر زینے اترتی چلی گئی۔ نیما راشدی زندگی میں پہلی بار حد سے زیادہ مضحمل نظر آتی تھی۔ یہ لڑکی اسکی سوچ سے زیادہ ڈھیٹ تھی۔

Safar-e-Adab

دیوانہ دیکھا ہے؟ مہدی کبیر کی موجودہ حالت وہی تھی۔ وہ سینے پہ لگی پٹی، ٹانگے اور زخم کی پرواہ کئے بغیر فرش پہ پڑے تازہ خون میں اپنی سفید جیکٹ بھگورہا تھا۔ کوئی انسان اپنے ہی خون کے ساتھ اتنا بے رحم تب ہو سکتا ہے جب بات سروائیول کی ہو۔ وہ جیکٹ خون سے بھگو کر آتا اور اسے دیوار پہ پھیرتا جاتا یوں جیسے پیٹ کر رہا ہو۔ سفید دیواریں اب خون کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ اسکے ہاتھ، کپڑے سب خون میں تر ہو رہے تھے۔ چونکہ وہ بیمار تھا اس لئے اسے تازہ پانی کی دو سفید بوتلیں فراہم کی گئی تھیں اب وہ اس پانی سے اپنے ہاتھ اور چہرہ دھو رہا تھا۔ دیواریں اب واقعی سفید نہیں رہیں تھیں۔ خون کا اصل رنگ تو نہیں رہا تھا مگر اب وہ ہلکی نارنجی نظر آرہی تھیں۔ وہ سفیدی جو آنکھوں کو چبھتی رہی تھی وہ ختم ہو چکی

تھی۔ اسکے دل کے ایک کونے میں کوئی طمانیت سی اتری تھی۔ لیکن اب بھی بہت کچھ تھا جس نے اسکے اعصاب تھکا کر رکھے تھے۔ وہ سفید بتیاں۔ مہدی نے بہ دقت جھک کر وہ مگ اٹھایا جس میں اسے سفید مائع دیا جاتا تھا۔ کمرے کے عین بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اس نے وہ مگ ایل ای ڈی کی طرف اچھالا۔ بتی چمکا چور ہو کر گری۔ اسکا نشانہ اس وقت بھی اچھا تھا جب اس نے یونان کی گلیوں میں اپنے تعاقب کار کا سر پھاڑا تھا اور آج ڈیڑھ سال بعد بھی اسکا نشان اتنا ہی اچھا تھا۔ کمرے میں روشنی قدرے کم ہو چکی تھی۔ یہ سفید اسکی زندگی سے کبھی نہیں نکل سکتی تھی لیکن ایک کوپنگ کمینزم چند دن اسکے کام ضرور آسکتا تھا۔

وہ واپس اپنے بستر تک آ کر بیٹھا۔ کمر دیوار سے جوڑی۔ اسکے جسم پہ اب بغیر بازو والی گول گلے کی سفید شرٹ تھی۔ اسکا سفید جیکٹ خون آلود ہو گیا تھا۔ مہدی اب اپنے سانولے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ سفید کے علاوہ ایک اور رنگ۔

”میں نے کیسے خود کو نظر انداز کیا؟ کیسے میں نے خود کو پس پشت ڈالا؟ کیوں میں ساری زندگی رشتوں کے پیچھے بھاگتا رہا؟“ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے خود سے سوال کر رہا تھا۔ پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔

”ایک لمبا عرصہ میں نے کیوں اپنی ناقدری کی؟ مجھے شاید لگا تھا میں قیس اور اپنے خاندان کے بغیر کچھ نہیں ہوں لیکن آج یہاں ان میں سے کوئی بھی تو نہیں ہے۔ پھر بھی میری پہچان وہی ہے۔ مہدی سرور کبیر۔ میں تو خود کو خود بناتا ہوں۔ آس پاس کوئی طے نہیں کرتا میں کون ہوں۔ پھر میں نے کیوں کسی کو یہ طے کرنے دیا؟ میں یہ کیوں بھول گیا میں کون ہوں؟“ بڑبڑاہٹ ہلکی تھی۔ بے حد ہلکی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر میٹرلس پہ پڑا وہ چھوٹا سا آئینہ کا ٹکڑا اٹھایا۔ اسکے لئے ہمت درکار تھی۔ اسکے لئے بڑی مشقت کرنی پڑی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے آئینہ اپنے چہرے کے آگے کیا۔ اسکا چہرہ اب آئینے میں نظر آ

رہا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں تک ابھر آئی تھیں۔ ماتھے، ہونٹ اور رخسار پہ اب بھی زخم کے نشان تھے۔ جو مندمل ہونے کے قریب تھے۔ گردن پہ ایک زخم تھا۔ اور آنکھیں اسکی کائی جیسی سبز آنکھیں جن کے گرد ایک بھوری سی لکیر سی بن رہی تھی۔ ان میں کانچ جیسی چمک تھی۔ مہدی محویت سے انہیں تکتا رہا۔ لمبی پلکیں جو کہ ہلکی خم دار تھیں۔ وہ کئی لمحے اپنی آنکھیں دیکھتا رہا۔ پھر ان میں جھلملاہٹ اتری، پھر وہ ڈبڈبائیں۔ پھر ان سے کچھ قطرے اسکے چہرے پہ گر کر اسکی بڑھی ہوئی شیو میں جذب ہونے لگے۔

”میں نے کیسے تمہاری ناقدری کی؟ میں نے کیسے تم سے رخ موڑا..... کیسے میں نے خود کو رولا۔ یہ میں نے کیوں کیا؟“ وہ کسی نو عمر بچے کی طرح روتے ہوئے پچھتاؤوں میں گھرے ہوئے خود سے شکوہ کر رہا تھا۔ اتنے سال لوگوں کے درمیان گھل کر وہ بھول گیا تھا کہ مہدی بھی ایک ”بسل“ ہے۔

”یہ آنکھیں دنیا کی سب سے خوبصورت آنکھیں ہیں۔“ کوئی سبز آنکھوں والی معتبر عورت اس سے کہہ رہی تھی۔ پھر وہ اسکی آنکھیں چوم رہی تھی۔ اسے وہ لمس آج بھی محسوس ہوتا تھا وہ اسکی ماں تھی۔ یہ آنکھیں اسکی آنکھیں تھیں۔ یہ نوبل تھیں، مہدی کسیر کا اصل تھیں۔ اس نے کیسے ان آنکھوں سے بے رخی برتی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ گیلی زکام زدہ سانس اندر کھینچی۔ آئینہ یونہی اپنے چہرے کے آگے رکھا۔ ”تمہیں پتہ ہے مہدی تمہارا صیاد کون ہے؟“ کوئی اس سے بات نہیں کرے گا تو کیا ہوا؟ مہدی وہی انسان تھا جس کی باتیں آدھی دنیا سنتی تھی۔ ”تم لوگوں کے چہرے پہچانتے ہو انکے تاثرات پہچانتے ہو، لوگ تمہیں فیسینیٹ کیا کرتے تھے تم اپنے صیاد کو کیسے نہیں پہچان سکتے؟“ اسکی آواز اب ہلکی ہو گئی تھی۔ ”قیس نہیں اگر قیس ہوتا تو وہ تمہیں سیدھا مار دیتا مہدی۔ وہ لمبے لمبے جھمیلوں میں نہیں پڑتا۔“ اتنے دنوں سے وہ کسی انسان کی سوچ سے بھی دور بھاگ رہا تھا اتنے دن وہ یہ نہیں جانتا چاہتا تھا اسے

یہاں لانے والا کون ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا مہدی کو صرف رہائی چاہیے تھی۔ اب صرف رہائی نہیں چاہیے تھی اب اسے وہ نام چاہیے تھا جس نے اسے تکلیف دی۔ تاکہ یہاں سے نکل کر وہ بھی اسے اتنی ہی تکلیف دے۔

”کیا جاشیہ؟ او نہوں وہ اس حد تک نہیں جاسکتی اور اسکے اتنے کنٹیکٹس نہیں ہیں جو تمہیں یہاں رکھ سکے۔“

پھر کون مہدی؟ پھر آخر کون؟ تم نے کس کے ساتھ ایسا کیا غلط کیا ہے جو تمہیں کوئی اس حد تک نقصان پہنچانا چاہے؟ کیا تم نے کسی کو ہرٹ کیا ہے تم.....؟ یکدم وہ ٹھہر گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ اور اسکے دماغ میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال لپکا۔ خیال کے ساتھ ایک بھولا بسر منظر بھی وہ کس سے، کب، کہاں نظر چراتا؟

سبز آنکھوں کی پتلیاں ایک بھنور میں تبدیل ہوئیں۔ بھنور میں برکھا، ساون، بہار کی رتوں سے دور خزاں کی ایک شام میں ایک منظر ہمارا منتظر ہے۔
BEING THE STRING OF YOUR KITE
براق حنیف کے بنگلے پہ شام تازہ تھی۔ اسکی بیچلرز پارٹی کے لئے مہمانوں کی آمد ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ مگر اسکے عزیز ترین دوست آچکے تھے۔

”افرین ممی کہاں ہے؟“ پول کے پانی میں پیر ڈالے براق نے اپنی دائیں طرف بیٹھے مہدی سے سوال کیا۔ مہدی کا سارا دھیان اپنے موبائل پہ تھا وہ کھٹاکھٹ ٹائپ کرتا نظر آ رہا تھا۔ ”اوبھائی نکل آؤ ان چکروں سے، نکل آؤ میں نے ان پہ ایک عمر لگا دی لیکن ملا کچھ نہیں۔ اور جب ان سب سے نکل کر دیکھا تب پتہ چلا زندگی اصل میں ہے کیا چیز۔“

”اچھا؟ کیا ہے زندگی؟“ وہ ہنوز ٹائپنگ میں مصروف تھا۔

”شیزل۔“ براق نے مسکراتے ہوئے یک لفظی جواب دیا۔ ”پہلے والا براق اب بدل گیا ہے۔ اب میرے لئے ایک لفظ، ایک انسان زندگی کو سمجھ کر سکتا ہے۔“

ماضی کے ان خوشگوار قصوں میں براق اس سے کچھ کہہ رہا تھا مگر مہدی نے زینیا کی چیٹ دیکھی۔ آن لائن کا وہ سبز نقطہ، اسکے مختصر جملے، اسکے جواب، اسکے لکھنے کا انداز، اسکی پروفائل، اسکے typos، چیٹ کی وہ تھیم، دھڑادھڑاتے میسجز کے درمیان صرف اسی کو جواب دیتے یونہی بیٹھے بیٹھے اسے اندازہ ہوا اب تو وہ بھی زندگی کو ایک انسان، ایک لفظ میں سمجھ کر سکتا تھا۔

”تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا مہدی۔“ وہ جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”میں ٹھیک سے ہرٹ نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس روز میں ایسی بات نہیں کہتا۔“ مہدی نے اچھنبے سے اسے دیکھا اور پھر اسے وہ بات یاد آگئی۔ مہدی محظوظ انداز میں مسکرایا۔ ”کوئی اگر شیزل کے حوالے سے مجھے ہرٹ کرے گا تو میں اسے اس سے زیادہ تکلیف دے سکتا ہوں۔ بلکہ مجھے لگتا ہے ہر جمع تفریق اب ختم ہو گئی ہے۔ اسکے لئے ہر حد پار سکتا ہوں میں۔“

”بھائی تم تو اچھے خاصے مجنوں بن گئے ہو۔“ وہ واقعی محظوظ ہوا تھا۔

”تم سے کہیں زیادہ کم۔“ اس نے مہدی کے موبائل کی طرف اشارہ کیا وہ ہنس پڑا۔ چہرے پہ الو ہی خوشی تھی۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“

”یعنی تمہارے پاس اب تک ایسا کوئی نہیں ہے جس کے لئے تم ہر جمع تفریق بھول جاؤ؟“

مہدی نے کوئی جواب دیا تھا جسے اب وہ یاد نہیں کر پارہا تھا مگر اسے جو جو یاد آیا تھا وہ ایسا تھا جس نے اسے جامد کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گیا۔ ساکن، صامت۔ اسکی دنیا الٹ پلٹ کر رہ گئی تھی۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ اسے نیند نے آلیا، نیند کے بعد بھی وہ کئی گھنٹے جاگتا رہا۔ غالباً دوسرا دن تھا جب زرقون اسکے کمرے میں داخل ہوا۔ وہی چبھتا ہوا سفید کافتان، وہی میڈیکل باکس، وہ اسکے قریب آ کر بیٹھا۔ میڈیکل باکس سے ایک انجکشن نکالا۔ زرقون ہر رات اسے نشہ آور ادویات انجیکٹ کرتا تھا تاکہ دوائیوں اور محلول کے رنگ مہدی دیکھ نہ سکے۔ اس نے آج بھی وہی کرنا چاہا مگر مہدی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”کیا میری بیوی بھی تمہارے پاس کے پاس ہے؟“ اسکی آواز یہاں سے دور براق کے کانوں تک بھی گئی تھی۔ آفس میں بیٹھے ہوئے اس نے ٹیبلٹ آنکھوں کے آگے کیا۔ اور غور سے سکرین دیکھی۔

”اگر وہ تمہارے پاس ہے تو کیوں ہے؟ میری اس سے بات کرواؤ۔ یا پھر اپنے پاس سے بات کرواؤ۔ مجھے قید رکھنے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”کون ہے میرا پاس؟“ چبا چبا کر پوچھا۔ مہدی نے سادگی سے اسے دیکھا۔ چند پل خاموشی سے دیکھتا رہا۔ دوسری طرف براق سانس روکے سکرین دیکھ رہا تھا۔ اسے مہدی کی آنکھوں میں کچھ نظر آ گیا تھا۔

”براق حنیف سے کہو مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“

دوسری طرف براق نے بے اختیار کرسی کا سہارا لیا تھا۔ اسکے چہرے کی رنگت اس کمرے سے زیادہ سفید تھی۔ گرفت تو زرقون کی بھی اسکے بالوں پہ ڈھیلی پڑی تھی مگر چہرہ اور اسکے تاثر نہیں بدلے۔

”کون براق حنیف؟“

مہدی دھیرے سے مسکرایا۔ ایک عجیب شیطانی مسکراہٹ۔ ”میرا دوست براق حنیف۔“ ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کروایا۔ ”دوستی میں انسان راز کہہ دیتا ہے۔ اسے بتاؤ کہ اس نے بھی مجھ سے کچھ راز کہے تھے۔ اسے بتاؤ میں لوگوں کی باتیں نہیں بھولتا۔“

کرسی پہ بے دھم پڑے براق کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے دنیا اپنے سر پہ گھومتی محسوس ہوئی۔ کسی نے اس کے پیروں سے زمین کھینچ لی تھی۔

”ماضی کے خوشگوار دور کا ذکر ہے۔“

جنوری کی تہ بہ تہ شاموں میں سے ایک کا قصہ ہے۔ پینٹ ہاؤس کی دیواروں کے شیشوں پہ بارش کے قطرے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ اندرا کا دکا زرد بتیاں روشن تھیں۔ لاؤنچ میں رکھے تھری سیٹر پہ قیس لیٹا ہوا تھا۔ کاؤچ پہ براق تھا اور ایل شپ صوفے پہ مہدی کہنیوں کے بل اوں دھے منہ لیٹا تھا۔ قیس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ جب براق کو کسی کیڑے نے کاٹا۔

”لو سفر، اپنے ہی آفس میں کیوں کتوں کی طرح کام کرتے ہو؟ دیکھو اب مووی نائٹ پہ نیند آرہی ہے ناں۔“

”میں کب ”تمہاری“ طرح کام کرتا ہوں؟“ وہ بڑبڑایا۔ مہدی ٹی وی پہ نظریں جمائے ہنس پڑا۔

”براق خفا ہوا۔“ تم دونوں ایک طرف ہو جاتے ہو اور مجھے اکیلا کر دیتے ہو۔ یہ غلط ہے مہدی۔“

”پن سے گاڑھا خون۔ بھائی تو پھر بھائی ہوتا ہے ناں۔“ اس کے اس انداز پہ بالی وڈ کی مشہور فلم کرن ار جن کا سیکوئل بن سکتا تھا۔

”پھر میں کیا ہوں؟“

”بتایا تو ہے“ کتے۔“ قیس نے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مہدی دوبارہ ہنس پڑا۔ دل فریب، بے ریا ہنسی۔ یہ وہ دن تھے جب ان تینوں کے درمیان دوستی ہوا کرتی تھی۔

”فلم دیکھو تم اس ممی کو چھوڑو۔ اب یہ صبح سات بجے آنکھیں کھولے گا۔“ سوتے ہوئے قیس پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر مہدی اٹھ کر اسکے قریب آیا۔

”کیا دیکھو ولن کو سزا دینی ہی نہیں آتی۔ کسی کو سفید کمرے میں بند کر دینا کہاں کی سزا ہوئی؟“ براق سکرین پہ چلتی ہالی وڈ فلم کا ایک منظر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسے چاہیے تھا مار دیتا اور جان چھڑواتا۔“

مہدی نے صوفے پہ پڑا کمبل اٹھا کر اسکے سینے پہ ڈالا۔ ”سزا دینی ہے تو یہی طریقہ ہے۔ مار کر تو جان چھڑوائی جاتی ہے۔ کسی کو تڑپانا ہو تو اسکی زندگی سے رنگ، لوگ، محفل، دنیا چھینی جاتی ہے۔“ وہ اسے کندھے سے تھام کر اسکا رخ پلٹ رہا تھا کہ ٹی وی کی روشنی اسکے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ ”میرا تو یہی طریقہ ہوتا۔ انسان اگر کسی کو مارنے جتنی جرات کرتا ہے اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سامنے والے نے اسے ہرٹ کیا ہے اور جس نے ہرٹ کیا ہے اسے ایک ایک لمحے کا حساب دینا چاہیے ہے ناں؟“ کیا یہ وہی مہدی تھا جسے ہم جانتے ہیں؟

براق اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ نرم نگاہیں، فکر مند سا انداز لئے اپنے بھائی کی نیند تک کے لئے پریشان تھا اور یہی وہ آدمی تھا جو کسی کی زندگی کو جہنم بنانے میں متامل نہیں تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ کافی دیر بعد براق بولا۔ ”لیکن جب کوئی مجھے ہرٹ کرتا ہے تب میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ بغیر بتائے، میں اس لیول پہ نہیں جاسکتا۔“

”پھر شاید تم ہرٹ ہوئے ہی نہیں۔“ مہدی نے ریموٹ اٹھا کر منظر گونگا کر دیا۔ ”جو ہرٹ ہوتا ہے ناں وہ ہر جمع تفریق بھول جاتا ہے۔ جب تم ہرٹ ہوئے تب پوچھوں گا۔“

براق کچھ بول نہیں سکا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب قیس نے اسکے باپ کو قتل کیا تھا اس دن اسکا دل چاہا تھا وہ اسے کسی قبر میں زندہ ڈال دے۔ جب کسی نے اسکی ماں کو اسکے گھر میں قتل کیا تھا تب اسکا دل چاہا تھا وہ اس قاتل کو ڈھونڈے اور صحیح غلط کی ہر تفریق چھوڑ کر اسے برباد کر دے۔ اور اس روز جب شینزل نے اسے چھوڑا تھا تب شراب کے نشے میں دھت اسکا دل چاہا تھا جس نے اسکی زندگی سے رنگ نکال دیئے وہ اس کی زندگی رنگوں سے خالی کر دے۔

کرسی پہ بے دھم ہو کر گرے ہوئے اسے احساس ہوا مہدی دوست تھا۔ دوست چاہے کیسا بھی ہو اس میں ایک چیز ہوتی ہے وہ آپ سے ”واقف“ ہوتا ہے۔ مہدی بھی اس سے واقف تھا۔ دوستوں کے پاس راز ہوتے ہیں مہدی کے پاس بھی اسکے راز تھے۔

”اس سے پوچھو وہ ایسی بکواس کیوں کر رہا ہے۔“ براق کی آواز خالی تھی۔ کھٹکتی ہوئی۔
BEING THE STRING OF YOUR KITE

زرقون پنوں کے بل مہدی کے قریب بیٹھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کون براق حنیف کس کی بات کر رہے ہو تم؟“

”وہی براق حنیف جس کی ہونے والی بیوی نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ میں نے، مہدی کمبیر نے اسے بتایا کہ وہ آدمی کتنے ہلکے کردار کا ہے۔ میں نے بالکل ٹھیک کیا۔ ہزار دفع موقع ملے میں ہزار دفع ہر شینزل کو ہر براق سے بچاؤں گا۔ اسے بتاؤ لوگ زیادہ عرصے تک مجھ سے مخفی نہیں رہ سکتے۔“

”وہ واپس آئے گی میرے پاس وہ صرف ناراض ہے، وہ واپس آجائے گی۔“ براق زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

”یہاں آنے کے بعد میں ہر دن سوچتا رہا مجھے یہاں کون لا سکتا ہے؟ شاید قیس لیکن نہیں۔ وہ لمبے جھمیلے میں نہیں پڑتا وہ قصہ ختم کرنے کا عادی ہے۔ اور پھر مجھے میرا دوسرا دوست یاد آیا۔ تمہیں ڈھونڈنا بہت آسان تھا براق۔ تم کیوں بھول گئے میں ایک پبلک اسپیکر ہوں۔ میں لاکھوں لوگوں سے ملا ہوں۔ میرا واحد کام ہے لوگوں کی سائیکس پیچانا۔ تم کیوں بھول گئے مہدی کو لوگ ڈراتے نہیں فیسینیٹ کرتے ہیں۔“ اب کے وہ زرقون کے کان کے پاس جھک کر بولا۔ زرقون نے طیش میں آکر اسے ایک مکا رسید کیا۔ مہدی نیم دیوانگی کی سی کیفیت میں ہنس پڑا۔ زرقون اسے یونہی چھوڑے باہر نکل آیا

”یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے آپ جانتے ہیں وہ یہاں سے نکل کر کیا کرے گا؟ اسے آپ کا نام تک پتہ ہے اسے یہ سب کیسے پتہ ہے؟“

”میں کوئی عادی مجرم یا پھر تربیت یافتہ مجرم نہیں ہوں۔ میرے پلان میں جھول ہو سکتے ہیں۔“ اسکا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔ ”یہ میرا قصور نہیں ہے کہ وہ ایک وقت میں میرا بہترین دوست رہ چکا ہے۔ یہ بھی میرا قصور نہیں ہے کہ مہدی کمبیر ایک پبلک اسپیکر ہے۔ اور لوگوں کے معاملے میں وہ بہترین ہے۔“

”اور اب میرے لئے کوئی حکم؟ کیا کروں میں کیا اب بھی اسکے تلوے چاٹتا رہوں؟“

براق نے ضبط کیا۔ اسکے موبائل پہ کوئی کال آنے لگی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی۔ اور میز پہ رکھا لپ ٹاپ کھولا۔ وہ یہاں سے کوئی میسج بھیجنے والا تھا مگر سکرین پہ لگی۔ تصویر کو دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔ دو لوگ بھرپور مسکرا رہے تھے۔ تیسرا سنجیدہ تھا۔ بس آنکھیں شاید مسکرائی تھیں۔ قیس، براق، مہدی۔ وہ تینوں ساتھ تھے۔ محض تصویر میں۔ یہ غلط ہے ویسے۔ جب لوگ چھوٹ جائیں، تعلق ٹوٹ جائیں تو یادوں کو

کرپٹ ہو جانا چاہیے، تصاویر کو مٹ جانا چاہیے اور محض ایک لمحے کے لئے بھی دل میں پہلے والے جذبات واپس نہیں آنے چاہئیں۔ ایسا ہونا چاہیے ہے ناں؟

”get rid of him“ لیپ ٹاپ کی سکرین بجھاتے ہوئے وہ بے چک انداز میں بولا۔ ”دودن بعد یہاں سے نکلنے والے اگلے کنٹینر میں اسکی لاش آنی چاہیے۔“

زر قون لمحے بھر کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ پھر ”راجرباس کہہ کر کال کاٹ دی۔ اسکے چہرے پہ بھی اضطراب صاف تھا۔ زر قون کاظمی کسی قتل کا حصہ بنانے نہیں آیا تھا۔ یا پھر جس طرح سب ہو رہا تھا اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔

شہزادیاں ناخوش زندگی گزارتی ہیں اس نے کئی بار سنا تھا مگر وہ اس جملے کو حقیقت بننے دیکھے گی یہ اسکے گمان سے باہر کا قصہ تھا۔ عالم نواب کی حویلی کے پچھلے باغ میں ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھے ہوئے اسکی افسردہ آنکھیں اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب پہ جمی تھیں۔ اسکے پاس موبائل لیپ ٹاپ کچھ بھی نہیں تھا۔ مظفر غوری سے رابطہ اب خواب لگتا تھا۔ اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر مظفر سے ہونے والی آخری بات کو یاد کیا۔ اسکے فرار کا واحد راستہ۔

”میں نے صرف تمہارے مسائل نہیں سننے ہوتے کو بج، مجھے یہ بھی تو دکھائی دینا چاہیے کہ تم انہیں اپنی زندگی پہ کیسے استعمال کرتی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تم نے ”ناں“ اور ”انا“ کا فرق سیکھا؟“

”تم نے وہ ایکویشن کر لی جو میڈم فائزہ نے دی تھی؟“ یاسمین نے اپنا رجسٹر کونج کے ڈیسک پہ دھپ سے رکھتے ہوئے پوچھا۔ انداز میں بے نیازی تھی۔ وہ ٹیچرز سے لے کر پرنسپل تک سب کی فیورٹ تھی اور کوئی اسے ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”ہاں کر لی ہی۔ بس سبٹ کروانا رہتا ہے۔“ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے اس نے بامشکل جواب دیا۔

”مجھے دکھاؤ میں method دیکھ کر واپس کر دوں گی۔“ اس کے انداز میں ہنوز مغرور سا تاثر تھا۔ کونج نے اب کے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ یاسمین اگلے ڈیسک پہ بیٹھتی تھی۔ میڈم فائزہ نے پہلے اس کا کام دیکھنا تھا یعنی کونج کی دو گھنٹوں کی محنت ردی ہونے والی تھی؟ ”مجھے تو ماریہ نے بھی کہا تھا کہ وہ مجھے سمجھا دے گی لیکن میں نے اسے کہا کونج کا انداز سادہ اور خوبصورت ہوتا ہے۔“ وہ اپنے سرمئی نیل پینٹ میں رنگے ناخنوں سے رجسٹر پہ میوزک بجا رہی تھی۔ اسکے ہاتھ بلاشبہ بہت خوبصورت تھے۔ وہ کونج کی تعریف بھی کر چکی تھی اسکے اندر کی پیپل پلیزرنجی اندر تک چپ ہو گئی۔ ”کونج؟ میں تم سے بات کر رہی ہوں تم سن رہی ہو؟“ اب کے وہ ناگواری سے بولی۔

کونج نے لمحے کے ہزارویں حصے میں خود کو کمپوز کیا۔ ”ٹیچر نے کہا تھا سب اپنی طرف سے کام کریں تم نے نہیں کیا؟“

”ہاں میں کل شاپنگ پہ چلی گئی تھی۔ پھر رات میں میرا موڈ نہیں ہوا۔“

وہ لب چباتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ اسے انکار کرنا بد تمیزی نہیں تھی کہ کیونکہ وہ لڑکی اپنی priorities کو ایک طرف رکھ آئی تھی۔ اسکے انداز میں تحکم تھا۔ اسکا انداز احسان کرنے والا تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو یہ کوئج کا موقع تھا وہ اسے ہنستے ہنستے کسی اور کو نہیں تھما سکتی تھی۔

”میں اپنا رجسٹر نہیں دے سکتی آئی ایم سوری۔“ حالانکہ اسے سوری کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ”میں کام چیک کروالوں پھر تمہیں سمجھا سکتی ہوں اگر تم چاہو۔“ وہ مسئلہ over explain کر رہی تھی لیکن کوئی بات نہیں۔

یا سمین اسے یوں دیکھتی رہی جیسے یقین ہی نہ کر پا رہی ہو۔ کوئج کا دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ماتھے پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے۔ دل میں وہ خود کو ملامت بھی کر رہی تھی مگر یہ آغاز سفر تھا۔ منزل تک جاتے جاتے پھولا تنفس نارمل ہو ہی جاتا ہے۔

”تم اب بھی معاشرے کے نام نہاد بیوٹی اسٹینڈرڈز پہ جمی ہوئی ہو یا اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہے؟“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

کالج میں آدھی چھٹی کا وقت تھا۔ جب کوئج چاٹ اور کولڈ ڈرنک لے کر کلاس میں داخل ہوئی۔ اسکی ہم جماعت لڑکیاں اسکے جانے سے پہلے ایک ڈیسک پہ ٹولی کئے ہوئے تھیں۔ اور اب جب وہ واپس آئی تو راین (وہ لڑکی جس کے گرد سب جمع تھیں) وہ افسردہ سی ایک کونے والے ڈیسک پہ بیٹھی تھی۔ وہ اپنی پلیٹ اور کولڈ ڈرنک لئے اسی طرف چلی آئی۔

”تمہاری منگنی ہوئی ہے ناں؟ تصویر تو دکھاؤ اسکی۔“

”رہنے دو، تم نے بھی باقیوں کی طرح مذاق ہی بنانا ہے۔“ وہ رخ موڑ گئی۔

”میں کیوں مذاق بناؤں گی؟ دکھاؤ تو۔“ وہ مصر ہوئی۔ رامین نے اپنا موبائل کھول کر اسکے آگے کر دیا۔ چاٹ بھاڑ میں گئی کلاس فیلوز کے منگیترا اور شوہر دیکھنا زیادہ اہم تھا۔ لڑکا کوئی اکیس بائیس برس کا تھا۔ گندمی رنگت، مناسب قد اور خوبصورت نقوش۔ ”تمہارے منگیترا کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ بلکہ یہ پورا خوبصورت ہے۔ اللہ خوش رکھے۔“ اس نے دعا دیتے ہوئے موبائل واپس کیا۔ رامین استہزائیہ مسکرائی۔

”رنگ دیکھا ہے اسکا؟ سب کہہ رہے ہیں اگر یہ گورا ہوتا تو خوبصورت لگتا۔ اور اگر اسکا قد تھوڑا لمبا ہوتا تو کم از کم مجھ سے بڑا تو لگتا۔ مجھے تو یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ وہ مضرب انداز میں اپنی انگلیوں کے ناخن چبانے لگی۔ کونج کو حیرت نہیں ہوئی۔ معاشرے کے بنائے خوبصورتی کے اس نام نہاد جال سے تو وہ بھی آج تک نہیں نکل سکی تھی۔

”یہ سب matter نہیں کرتا یار۔ رنگ، قد، اور عمر خوبصورتی کا معیار نہیں بتاتے۔“ وہ مظفر کے ہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ ”اگر وہ تمہارے ساتھ اچھا ہے تو وہ خوبصورت ہے۔ رنگ اور قد ایک دن ختم ہو جاتا ہے وفاداری رہ جاتی ہے اور“ BEING THE STRING OF YOUR KITE

”تم تو خود کو اسی طرح بہلاؤ گی ناں تمہارا اپنا رنگ بھی ایسا ہے۔“ وہ پریشانی میں کیا کہہ گئی اسے پتہ نہیں چلا۔ ”مجھے دیکھو میرا رنگ دیکھو تم میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتیں۔“

کونج کی رنگت بجھ گئی تھی۔ مگر آج یہ جملے اسے پہلے کی طرح ”بہت برے“ نہیں لگے۔ اس نے سن لیا اور سہہ گئی۔ دل کے ایک کونے میں اطمینان سا تھا کہ وہ درست سمت پہ ہے۔ لوگ نہیں سمجھتے نہ سہی۔ اپنے

دل کو سمجھانا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ دوسروں کے دلوں کے بھیدیوں بھی مخفی رہتے ہیں اپنا دل سکون پا لے یہ بہت ہوتا ہے۔

”تم نے مضبوط اور rude کے درمیان فرق سیکھا؟ مہربانی اور انسانیت کا درس سیکھایا آج بھی وہیں ہو؟“

”میں کیا پہنوں گی پھر؟“ ثانیہ رونے والی شکل بنائے اسکے سامنے بیٹھی تھی۔ تین سے چار جوڑے بیڈ پہ بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ ”ایک ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے یار میری خالہ کے سسرال والے اتنے خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں اور میں اپنے ہی خالہ زاد کی شادی میں یہ پہن کر جاؤں گی؟“ اس نے روہان سے انداز میں کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

ثانیہ اور کونج محلے دار اور بچپن کی دوست تھیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ اسکی پریشانی سے بڑی ہی بے نیاز کونج موبائل میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”کیا پہننا چاہتی ہو تم؟“

”مجھے لگھا چاہیے۔ لیکن میرا والا تو بنا ہی نہیں ناں۔ اماں نے اس پہ سوئی کا کام کروایا ہے اور وہ مجھ سے ہوتا کہاں ہے؟“ اس نے لپٹائی نظروں سے کونج کو دیکھا۔ ”اپنا ایک لگھا عنایت کر دونوں۔ وعدہ ہے جب تمہیں ضرورت ہوئی میں بھی اپنا کوئی ڈریس تمہیں دے دوں گی۔“ کونج نے موبائل سے چہرہ نکال کر اسے دیکھا۔ وہ سادہ دل اور معصوم تھی۔ نہ اس نے تحکم کا مظاہرہ کیا تھا اور نہ ہی وہ اسے استعمال کرتی رہی تھی۔ زینبی کے توسط کونج کے پاس بھی لگھوں کی بہتات تھی۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی۔ الماری کے ہینگر الٹ پلٹ کئے اور سیاہ رنگ کا ایک لگھا نکال کر اسکی طرف بڑھایا جس پہ سفید کام تھا اور شیشے دھوپ پڑنے پہ چمک رہے تھے۔

”یہ والا دونوں یہ تو بہت بار پہن چکی ہو۔“ اس نے سبز رنگ کے ایک گگھے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو نہیں دے سکتی۔ میرے سسرال سے عیدی میں آیا تھا۔“ جوڑے کو دیکھتے ہی کوئج مسکرائی۔ اپنے سسرال کے حوالے سے ہر لڑکی کے دل میں خوبصورت جذبات ہوتے ہیں۔ اس نے جوڑے کو ہاتھ میں لیا ایک بار پھر سے اسے دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے وہی سیاہ لگھا اسکی طرف بڑھایا۔

ثانیہ کے چہرے پہ ایسی خوشی آئی جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ ”اس کا خیال رکھنا۔ دوبار ہی پہنا ہے۔“ ثانیہ نے جھٹ اثبات میں سر ہلادیا۔ کسی کو خوشی دینا بڑی بات ہوتی ہے اور بڑے بڑے لوگ یہ کام نہیں کر پاتے۔

کچھ وقت بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اس میٹھی روٹی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جو ثانیہ نے شکریے کے طور پہ بھیجی تھی۔ کوئج حاکم کا دل ہلکا رہنے لگا تھا وہ لوگوں کی سوچ کے قید سے آزادی حاصل کر رہی تھی اور یہ آزادی دنیا کی ہر آزادی پہ بھاری ہوتی ہے۔

”اے لڑکی یہاں کیا کام ہے تمہارا؟“ ظفر کی تیز آواز پہ وہ فوراً آنکھیں کھول گئی ”اندر دفع ہو تم، اور دوبارہ یہاں نظر نہ آنا۔“

”میں بس پڑھنے آئی تھی چچا، میرا ایم ڈی کیٹ کا ٹیسٹ . . .“ ظفر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کتاب لی اور پھاڑ کر دو ٹکڑے کی۔ کوئج نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”تمہاری بہن کے کوئی کم کارنامے کئے ہیں جواب تم بھی اسی لائن میں آگئیں؟“ وہ اسکا ہاتھ پکڑے بکتے جھکتے اسے اندر لے جا رہے تھے۔ کوئج سن تھی۔ ایک لڑکی کی غلطی کی سزا پورے خاندان کی لڑکیوں کو دی جاتی ہے یہ جملہ اس نے سنا تھا آج یقین میں بدل رہا تھا۔ وہ چلی گئی تھی کوئج کی سزا شروع تھی۔

رات کے کسی پہر وہ گھر داخل ہوا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کی اور جیسے ہی باہر نکلا کوئی اسکا منتظر تھا۔ قیس نے اسے دیکھا اور اسے دلی رنج ہوا۔ سیاہ رنگ کے سادہ جوڑے میں اسکی آنکھیں سو جھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ سات ماہ کی پریگننسی اب اسکے جسم پہ واضح آثار دکھا رہی تھی۔ قیس نے نگاہیں چرائیں۔

”میری بیٹی کہاں ہے عبد اللہ؟“ گلوگیر لہجے میں کہتے وہ آگے آئی۔ اسکے عین سامنے۔ ”میری بیٹی؟ تم لے کر گئے تھے اسے، وہ کہاں ہے؟“ سیاہ آنکھوں والے مرد نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسکی ہر مصیبت کا ساتھی تھا۔ اور آج وجہ مصیبت۔ ”تم نے کہا تھا تم اسے جلدی گھر لے آؤ گے مجھے بتاؤ اسے کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”اس طرح ری ایکٹ مت کرو کہ میں گلٹی محسوس کروں۔ یہاں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ اسے دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا جب میرہ نے اسکا بازو پکڑ کر اسے روکا۔

”وہ میری بیٹی تھی تم نے اسے ایک جاہل اور پاگل آدمی کے حوالے کر دیا؟ میری حالت دیکھو تمہیں لگتا ہے میں یہ سب سروائیو کر سکتی ہوں یہ کیسے کر سکتے ہو تم؟“

”تم نے ہی کہا تھا میں تمہارا کچھ نہیں لگتا، ٹھیک ہے پھر اب واقعی کچھ نہیں لگتا۔“ اس نے کندھے سے جھٹک کر میرہ کو دور ہٹایا اور اس نے اسی تیزی سے آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ قیس کبیر کے منہ پہ دے مارا۔ ”میری بیٹی کو واپس لاؤ ورنہ میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گی۔“

وہ رخسار سہلاتے سیدھا ہوا۔ اسکی آنکھوں میں اب غضب ہلکورے لے رہا تھا۔ میرہ کی حالت دیکھتے اس نے مٹھی بھینجی ضبط کیا۔ ”یہ آخری بار تھا میرہ سرور۔ اگلی بار ایسی جرات کرنے سے پہلے ہزار دفع سوچ لینا کیونکہ میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔“ چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

”میری بیٹی واپس لا کر دوورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی عبداللہ۔“ وہ اسکی بات کا اثر لئے بغیر چلائی۔ قیس چند لمحے تحمل سے اسے دیکھتا رہا پھر اپنے گارڈز کو آواز دینے لگا۔

”میری بیٹی کو واپس لاؤ تم لا سکتے ہو عبداللہ۔ تم یہ نہیں کرو گے تو کوئی نہیں کرے گا۔ میرا بھائی پہلے ہی مر گیا ہے اور اب تم بھی ایسا کرو گے تو میرا سہارا کون ہو گا؟“ میرہ نیم دیوانی معلوم ہوتی تھی۔ ”تم کہو گے تو میں تمہارا پیروں میں گر جاؤں گی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی صرف میری بیٹی مجھے واپس لا دو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے پلیز، اسے واپس لے آؤ۔ تمہارا ہر انتقام مجھ سے ہے میری بچی کو بیچ میں مت لاؤ۔“

”اسے سرونٹ کو اڑیں لے جا کر بند کر اور صبح ہوتے ہی اسے اسکے باپ کے گھر چھوڑ آؤ۔“ وہ آدمی پتھر ہو چکا تھا۔ اسے پگھلانے کوئی آئے تو خود راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ ”کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے انہیں، لیکن اگر انکے ہاتھ کوئی ڈیوائس لگی یا پھر یہ کل سے پہلے یہ محل سے باہر نکلی تم سب کی چمڑی میں اڈھیڑوں گا۔“ حکم صادر کرتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ میرہ جیسے اب ہوش میں آئی ہو۔

”تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے قیس۔ میں پریگنٹ ہوں میں کیسے رہوں گی وہاں۔ میری بیٹی کو واپس لاؤ۔ میں پریس کا نفرنس کر کے ساری دنیا کو تمہاری اصلیت بتا دوں گی۔“ گارڈز کی گرفت میں وہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اپنے کمرے کی بالکنی سے یہ منظر دیکھتے ہوئے بختیار کبیر ساکن تھے۔ مہدی کو چھوڑ کر وہ اپنی بیٹی کے لئے اس درندے کا انتخاب کرنے والے تھے؟

محل کے اندر آتے آتے اسکے کان ان چیخوں پہ بے حس ہو گئے تھے۔ خالی محل کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا وہ ہر شے نظر انداز کرتے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بختیار کے کمرے میں آیا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور انہیں بالکنی میں کھڑے پایا۔

”فکر مت کریں آپ کی بیٹی کی سزا ایسی نہیں ہوگی۔“ وہ کرنٹ کھا کر پلٹے۔ انکا چہرہ لمحے بھر کو سفید پڑا تھا۔ قیس کے دل میں آری چل گئی۔ یعنی وہ ایک آدمی بھی اسکے ساتھ سچا نہیں تھا؟ ایک بھی نہیں۔ بختیار چند لمحے وہیں اپنی جگہ کھڑے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔ نارنجی کرنیں انکی پشت سے ہو کر پلٹ رہی تھیں۔

”یہ تمہارا خاندان ہے تم انہیں کیسے تباہ کر سکتے ہو؟“

”میں نے بنایا تھا، میں نے برباد کیا۔ کچھ غلط کیا؟“

”جانور بنتے جا رہے ہو تم۔ انتقام کھوکھلا کر دے گا تمہیں۔“

اسکے لب استہزائیہ مسکراہٹ میں ڈھلے۔ ایک کرب زدہ مسکراہٹ۔ ”میں کئی سالوں سے کھوکھلا ہوں۔ بس ایک وہ تھی۔۔۔۔۔“ اس کے ذکر پہ بھی اب وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ ”جسے میری فکر تھی۔ اس نے بھی چھوڑ دی۔ میری زندگی میں آکر مجھے چھوڑ دیا۔“ سر جھٹکا۔ آگے آیا۔

”بیٹی کی شادی کی مبارک دوں یا نانا بننے پہ پھول پہناؤں؟“ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے انکے درمیان سب ٹھیک تھا جیسے وہ سارے رازوں سے واقف تھا۔ بختیار سانس نہیں لے سکے۔ ”نیویارک کے جس اپارٹمنٹ میں آپ کی بیٹی رہتی ہے۔ وہاں سے سیڑھیوں سے گر جانا زیادہ بہتر لگے گا، یا کار ایکسیڈنٹ؟ او نہوں دونوں بورنگ ہیں۔ کسی پارٹی میں ہائی ڈوز ڈرگز کا کیا خیال ہے؟ کم از کم بچہ تو مر ہی جائے گا ہے ناں؟“

”تم ایسا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ کر سکتے۔“

”آپ کو بس میری صلاحیتوں پہ شک ہے چچا۔ میں کھڑے کھڑے آدھی دنیا برباد کر سکتا ہوں۔“ اسکی آنکھیں کہتی تھیں وہ یہ کر سکتا ہے۔

”وہ تمہاری . . . وہ . . . بہن ہے تمہاری۔“

”نہیں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں انکی بات کاٹی۔ ”میری بہن ایک حادثے میں مر گئی تھی۔ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ دو ہفتوں کے اندر وہ مجھے یہاں چاہیے اس گھر میں اور اگر وہ نہیں آئی تو آپ مجھ سے واقف ہیں۔“

”وہ نہیں آئے گی، تم اسے قتل کرنے کے لئے بلارہے ہو؟ ہر گز نہیں آئے گی وہ۔“

”زندگی میں نہیں بلائیں گے تو کوئی بات نہیں آپ کی موت اسے یہاں ضرور لے آئے گی۔“ انکے دو بدو کھڑا مرد کیا کہہ رہا تھا بختیار سمجھ نہ سکے۔ یہ الفاظ، یہ الفاظ اسی کے تھے جسے بیٹا سمجھا تھا؟

”تم مجھے مارو گے؟“

”اپنی زندگی کے لئے کچھ بھی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”یاد رکھئے گا صرف دو ہفتے ہیں آپ کے پاس۔“

بختیار کسبیر کے لئے وہ محل قبر سے بھی زیادہ چھوٹا پڑ گیا تھا۔ انہوں نے کبھی قیس کو اسکے برے پہ نہیں ٹوکا تھا اب وہی برائی انہیں نگل رہی تھی۔ قیس کسبیر وہ دلدل بن گیا تھا جواب اپنے آس پاس ہر ایک کو نگل رہا تھا۔

کسی نے چھت ٹاپی تھی۔ وہ آواز دھپ کی تھی۔ تیز بارش کی وجہ سے بجلی غائب تھی اور رات کے اس پہر سناٹا دل میں گھر کر رہا تھا جب زینیا کی سماعتوں نے یہ آواز سنی۔ کاٹھ کباڑ کے درمیان، جگہ بنائے وہ دبکی بیٹھی تھی اور آنے والوں کو اسکی موجودگی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ دبے پاؤں آئے تھے، انکا انداز سرگوشیانہ تھا، اور آمد ڈھکی چھپی۔ زینیا حاکم کورات کے اس پہر چھت پہ ان دو مردوں کی موجودگی کی وجہ جاننے کے لئے کسی قسم کی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں پڑی۔

ہاں وہ مرنا چاہتی تھی، ہاں اسے اس زندگی سے اب محبت نہیں رہی تھی، ہر دن اضافی تھا۔ ہر سانس سے بے زاری تھی مگر بلوچستان کی روایات میں ہے احسان کرنے والے، پناہ دینے والے کے احسان کو بھولا نہیں جاتا، اس پہ کسی قسم کی مصیبت برداشت نہیں کی جاتی۔ اور ہر طرح سے اسکی حفاظت کی جاتی ہے۔ یہ علاقہ، اور اس کے مکین احسان کے بدلے غلام بن جاتے ہیں۔ اور وفادار بھی۔ وہ بھی انہی پہاڑوں کی بیٹی تھی۔ اسی علاقے کی غیرت اور لاج اسکی آنکھوں میں تھا۔

ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے اس نے وہ پیچکس اٹھالیا جس کا ہتھکڑاٹھ جانے کی وجہ سے اسے یہاں پھینکا گیا تھا۔ گلے سے دوپٹہ اتار کر ایک ہاتھ میں لیا اور گلے کو تر کیا۔ چھت پہ کھڑا وجود اب نیچے کی طرف دیکھ رہا تھا، شاید وہ اپنے ساتھ کو اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ گہرے سناٹے میں اب کسی کے پائپ چڑھنے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ زینیا نے اینٹ کا ٹکڑا دوپٹے میں باندھا اور ہلکی سی آہٹ پیدا کی۔ آدمی فوراً اس طرف ٹارچ مارنے لگا مگر وہ گتوں کی اوٹ میں تھی۔ نظر نہیں آئی۔ چند پل بعد وہ ذرا مطمئن ہو کر چھت کا

دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے زینیا کے اعصاب شل ہونے لگے۔ کسی کو معلوم نہیں پڑتا اگر وہ مزاحمت نہ کرتی مگر پھر روایات کا کیا؟

وہ چلے جاتے چند چیزیں لے کر چوریاں آئے روز ہوتی ہیں۔ انہیں جانے دینا چاہیے۔ مگر اس نمک کا کیا جو اس نے کھا رکھا تھا؟ کم از کم وہ اس معاملے میں بزدل نہیں بن سکتی تھی بے غیرت بھی نہیں۔ آہستگی سے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر شومی قسمت پائپ چڑھ کر اوپر آنے والے آدمی نے اسے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھ فوراً قونکالا، زینیا نے بغیر ایک بھی لمحہ ضائع کئے دوپٹے میں بندھی اینٹ گھمائی اور اسکے چہرے پہ دے ماری۔

”ڈائن چڑیل میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اپنے گال پہ ہاتھ رکھے بنگالی میں غرایا۔ دوسرا لڑکا بھی دروازہ چھوڑ اسی طرف آیا جب زینیا نے پیچکس پوری قوت سے اسکے گھٹنے کے اوپر ران میں دے مارا۔ لڑکا بلبل کر رہ گیا۔ دروازہ کھولنے والا لڑکا تب تک قریب آ گیا تھا اور اس نے زینیا کا وہی بازو پکڑ کر موڑا جس میں گولی لگی تھی۔ لڑکی کے دماغ کی رگیں تک سن ہو گئیں۔ ”تیری جرات کہ تو ہم پہ ہاتھ اٹھائے؟“ وہ ہنوز بنگالی میں بک رہا تھا۔ زینیا کو کچھ سمجھ تو نہیں آ رہا تھا مگر وہ اس کا غصہ سمجھ سکتی تھی۔ بازو کا درد ایک طرف اس نے خود کو چھڑوانے کی کوشش کی۔ مگر درد ایسا تھا کہ وہ شل رہ گئی۔

جس لڑکے کو زینیا نے مارا تھا وہ کراہتے ہوئے آگے آیا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اسکے چہرے پہ دے مارا۔ وہ تیور کر پیچھے ہوئی۔ ”تیری جرات کیسے ہوئی مجھ پہ ہاتھ اٹھانے کی؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس تھپڑ نے زینیا حاکم کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ لڑکے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے بھی اس نے ٹانگیں جھلائیں۔ اور اچھل کر ایک زوردار لات اسکے پیٹ سے ذرا نیچے دے ماری۔ لڑکا درد سے تڑپ اٹھا۔ جس نے اسے پکڑ رکھا تھا اب وہ اسکی گردن پہ چاقو رکھ گیا مگر اسکے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ اسکی شہرہ رگ پہ چاقو پھیر دیتا اور کھیل ختم، لیکن اسکے اندر ایک لڑکی تھی جس نے اسے آج تک جھکنے نہیں دیا تھا۔ زینیا نے ہمت مجتمع کرتے پیچھے کھڑے لڑکے کے گھٹنے پہ وار کیا وہ لڑکھڑایا چاقو گرا۔ زینیا کسی زخمی شیرنی کی مانند مڑی اور اسے بغیر کسی مزاحمت کا موقع دیئے اسے تھپڑ دے مارا۔ لڑکے نے آگے بڑھ کر اسکے بالوں کو اپنی گرفت میں لیا اور یہی اسکا قصور تھا۔ زینیا نے اسے بھی بالکل ویسی لات ماری جیسی اس کرہتے لڑکے کو۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ منہ سے غوں غاں کی آواز بھی نہیں نکلی۔ وہ اب جھک کر وہی اینٹ میں بندھا دوپٹہ اٹھا کر پے درپے اینٹوں کے وار ان دونوں پہ کئے گئی۔ یہ تھاسروا نیول، یہ بقا بھی، احسان مندی بھی اور مزاحمت بھی۔ لڑکے پوری طرح دھل چکے تھے جب اس نے یونہی جھک کر ایک لڑکے کے ہاتھ اسکی پشت پہ باندھے دوسرا ادھ موا ہو چکا تھا۔ اسکے بال کندھوں کے آگے گر رہے تھے۔ چہرے اور آنکھوں میں عجیب سرخی تھی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس میں مزید کوئی ہمت نہیں بچی تھی۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے وہ گہرے لمبے سانس لینے لگی۔ غصہ تھا کہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ آگ تھی کہ بجھ نہیں رہی تھی مگر روایات نے اسے یہ بھی سکھایا تھا کہ کسی پہ تب تک وار کرنا ہے جب تک وہ جوابی وار کرتا ہے، تب نہیں جب وہ گر جائے۔ روایات لوگوں کی بھلائی کے لئے ہوتی ہیں، لیکن کچھ ٹھیکیدار ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ان میں رد و بدل کرتے ہیں اور لوگوں کو غیرت، بقا، اور بڑائی کے پاٹ پڑھاتے ہیں ورنہ کسی روایات کو خون ریزی کی اجازت نہیں ہے۔

دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھنے کی آواز پہ اس نے سیدھی ہونے کی کوشش کی۔ یکدم دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ اور نیاسمیت اسکے دونوں بھائی اپنے بیٹوں کے ساتھ اوپر آئے تھے۔ شب خوابی کی لباس میں، آنکھوں میں کچی نیند کا خمار لئے وہ لوگ حیرت سے اس ایک لڑکی کو تک رہے تھے جس نے دو مردوں کو چت لٹا رکھا تھا۔ اس کا چہرے پہ تھپڑ کا نشان تھا۔ حالت بکھری ہوئی۔

”یہ لوگ چوری کرنے آئے تھے۔“ اس نے اردو کی بجائے انگریزی میں کہا تھا۔ ”پولیس کو کال کر لیں۔“ ہر کوئی سکتے کے عالم میں تھا۔ نیما نے غور کیا زینیا نے انکی طرف نیم رخ کر لیا تھا۔ اسکا دوپٹہ اسکے پاس نہیں تھا۔ نیما نے آگے آکر اپنی چادر اتار کر اسے دی۔ زینیا نے اسی تیزی سے اسے سر پہ جمایا۔ ایسی ہوتی ہیں روایتیں جو غیرت اور حیا کا پاس رکھتی ہیں۔

”تم نے اکیلے ان دونوں کو مارا ہے؟“ تیما کا بھتیجا حیرت زدہ سا آگے آیا۔ زینیا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ ”میں نے نہیں تم نے مارا ہے انہیں۔“ وہ یکدم جیسے کچھ یاد آنے پہ بولی۔

”ارے میں نے کب مارا؟“ BEING THE STRING OF YOUR KITE

میرا نام لیں گی تو پولیس سو سوال کرے ”گی۔ میرے زخموں کی بابت پوچھے گی وار اگر مسئلہ بڑھ گیا تو میرا کارڈ وغیرہ بھی مانگا جاسکتا ہے۔ مجھے اس سب سے دور رکھیں۔“

”میں نے مارا ہے۔“ تیما آگے آئی اور زینیا کو نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ زینیا کی بات سمجھ چکی تھی۔ زینیا حاکم راشدی خاندان کا حصہ نہیں تھی وہ اگر انہیں مارنے کا جرم قبول کرتی اور اسکے ایک دوزخ دیکھنے کے بعد پولیس اگر اسکے باقی زخموں کی جانچ کرواتی تو گولی کا زخم ضرور دیکھ لیتی۔ اسکے بعد جو بکھیرے کھڑے ہونے تھے انکا اللہ ہی حافظ تھا۔

ذرا سی دیر میں مجمع چھٹ گیا تھا۔ نیما نے کپڑے بدل لئے، چہرے پہ گیلی مٹی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے تھپڑ مار کر چہرہ سرخ کیا۔ اور نیچے اب وہ پولیس کو بیان دے رہی تھی۔ لڑکے بار بار نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے، لیکن پولیس انکی بات نہیں سن رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا محلہ جمع ہو گیا تھا۔ ہر کوئی نیما کی دنگ طبیعت سے واقف تھا سو اس بات پہ یقین کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ دو تیلی جیسے پتلے لڑکوں کی دھلائی اسی نے کی ہے۔ کچھ چوروں کو بھی اپنی عزت عزیز تھی کہ انہوں نے اس چھوٹی موٹی لڑکی کا نام لینے کی بجائے خود کو نیما سے مار کھایا ہوا نامزد کروایا۔ نیما کے بھائیوں نے بھی لڑکی کا نام شامل نہیں کیا۔ فجر کے وقت ہر کوئی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گیا۔ یہ فجر کا سویرا زینیا کی زندگی سی سے ہر کثافت دھو گیا تھا۔

یہی وہ سہ تھا جب نیما اپنے اور زینیا کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ خلاف معمول زینیا حاکم بذات خود اپنے بازو کے زخم صاف کر رہی تھی۔ زخم میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ وہ کہنی کی جگہ سے اپنا بازو نہیں اٹھا سکتی تھی، مگر وہ اس سوچ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی کہ ایک دن یہ بازو کام کرنا چھوڑ دے گا۔ ایسا تھوڑی ہوتا ہے؟

”تم تو کہہ رہی تھیں تمہیں نہیں جینا تم مر جانا چاہتی ہو پھر اتنی مزاحمت کیوں؟“ وہ زینیا کے قریب آ کر بیٹھی۔

”پولیس سے کیا کہا آپ نے؟“ وہ بڑی صفائی سے انکے سوال کو نظر انداز کر گئی۔

تمہیں تو نہیں جینا تھا زندگی بے کار تھی ”ناں؟“ وہ اپنا سوال دہراتے ہوئے بتا رہی تھی کہ جب تک وہ اسکے سوال کا جواب نہیں دے گی نیما بھی اپنے سوال پہ ڈٹی رہے گی۔ زینیا اسے کیا بتاتی کہ وہ جو ہر جذبہ بھول چکی تھی وہ کیوں اس قدر طیش میں آگئی تھی۔ کیوں اسے وہ تھپڑ اتنا برا لگا تھا؟

”جو ہم پہ احسان کرے ہم اسکے لئے جان بھی دے دیتے ہیں۔ وفاداری آج کل ناپید ہے لیکن میرے علاقے میں آج بھی زندہ ہے۔“ اس نے اناڑی انداز میں پٹی اپنے بازو کے گرد باندھنی چاہی، جب نیما نے سفید پٹی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور خود اسکے پاس آکر بیٹھی۔

”تمہارا دماغ بہت چلتا ہے لڑکی۔ ورنہ میں تو تمہیں ہی پولیس کے آگے کرنے والی تھی۔“ اس نے بازو کے گرد پٹی لپیٹنی شروع کی۔ ”ویسے اپنے اس عمل کو کیا نام دینا چاہو گی؟“

”ایک اور احسان۔“

نیما ہنس پڑی۔ ”تم بہت عجیب ہو کسی نے تمہیں بتایا ہے؟“

”میں نے کسی کو اجازت نہیں دی وہ میری ذات پہ ایسے تبصرے کرے۔“ پٹی ہو گئی تو اس نے بازو پیچھے کھینچ لیا۔ نیما پیچھے ہو کر بیٹھی۔ اسے غور سے تنکے لگی۔ اسکے چہرے پہ ہمہ وقت اکھڑیا افسردہ تاثر رہتا تھا۔ وہ یقیناً ہنستے ہوئے پیاری لگتی ہو گی۔

”تم مرنا نہیں چاہتی ہیں ناں؟“ زینیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”تمہاری جینے کی موٹیویشن ختم ہے۔ اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرو کیونکہ زندگی سے زیادہ حسین کچھ نہیں ہوتا۔ میں انتظار کروں گی تم مجھے اپنے علاقے کے بارے میں مزید بتاؤ۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ اس ہفتے وحید صاحب آرہے ہیں اور میں انکے ساتھ واپس جا رہی ہوں۔ کل رات آپ کے سونے کے بعد آپ کا موبائل استعمال کیا تھا میں نے۔“

نیا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جواباً اس نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ جسے جانا تھا وہ جا کر رہتا ہے۔ وہ اسے جانے دے گی۔

کبیر محل کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس گھر کا واحد سربراہ اسٹڈی روم میں بیٹھا ایک اسکیچ بنا رہا تھا۔ کتابوں سے سچی دیواریں اسے یاسیت سے تک رہی تھیں۔ وہ ہر دفع یونہی کچھ بناتا رہتا تھا اور بختیار کسی کتاب سے کوئی quote پڑھ کر اسے سناتے تھے آج وہ نہیں تھے۔ وہ بددلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے پل وہ راہداری میں چل رہا تھا۔ پہلو میں گرے ہاتھ میں وہی کاغذ بوچر رکھا تھا۔ اس راہداری میں وہ مقصود کی آوازیں سناتا رہتا تھا۔ کبھی وہ کسی ملازم پہ برستے تھے۔ کبھی اپنی نگرانی میں کوئی کام کرواتے تھے۔ وہ آوازیں آج نہیں تھیں۔ وہ مانے گا نہیں مگر اسے خاندان یاد آرہا تھا۔

وہ کچن میں آیا۔ چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ بختیار گھر چھوڑ کر میرہ کے ساتھ اسکے باپ کے گھر چلے گئے تھے۔ مقصود، مہدی، انیسہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ قیس کبیر اکیلا تھا۔ تنہا۔ گلے میں کچھ اٹکا تو وہ کچن بھی چھوڑ آیا۔ باہر لان میں ایزل کی چھوٹی گاڑی نہیں تھی۔ اسکے کھلونے نہیں تھے۔ اسکے چھوٹے چھوٹے

بوٹ، کھکھلاہٹ کہیں نہیں تھی۔ وہ گردن اٹھائے اپنے محل کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں انسان نہیں تھے بس قیس رہ گیا تھا۔ بس قیس۔ اسے اس تنہائی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اسے گلابس ایک عورت سے تھا اگر وہ وفادار ہوتی تو قیس لعنت بھیجتا دیتا۔

دفتعا دروازہ کھلا اور ایک بارودی ملازم اندر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ قیس کے سامنے رک کر ادب سے سلام کیا۔ ”سر شیزل صاحبہ آئی ہیں۔ کہتی ہیں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔“

”اسے اندر بھیجو۔“ کہہ کر وہ خود بھی اندر کی طرف مڑ گیا۔

وہ لاؤنج میں آیا۔ سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر بتیاں روشن کیں، خود وہ ایک صوفے پہ آکر بیٹھا۔ گردن تنی ہوئی ہوئی تھی۔ اور اسکی ملاقاتی اسکے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ انکے درمیان خاموشیاں کبھی نہیں رہی تھیں۔ آج حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔

”مجھے بات کرنی تھی۔ تم ملنے کے لئے راضی نہیں تھے۔“ کئی لمحے بعد سفید کارڈیگن والی لڑکی نے خاموشی کو توڑا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”بات کرنے کو کچھ رہا ہی کب تھا؟ تم نے مجھے دھوکہ دیا ملکہ۔“ قیس اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ ”تم پہ اعتبار تھا۔ تم بہت کچھ جانتی تھیں لیکن تم نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“

”یہ ہماری چوائس تھی۔ ہم دونوں، بلکہ ہم تینوں میں کوئی بھی اس بات کا پابند نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس نے لگی لپٹی“ پہلے کب رکھی تھی جواب رکھتی؟

”لیکن ہم کرتے تھے، میں نے کی تھی۔“

”یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے کبھی تم سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا، کہا تھا کیا؟“

”یعنی تم ایک لمحے کے اندر میری ریاضتیں اور احسان ردی کر دو گی؟“

”تم یہ نہیں کہہ سکتے قیس کیونکہ ہم نے ہمیشہ فیورزدی ہیں کبھی یہ نہیں ہوا کہ ہم تینوں نے ایک دوسرے کے لئے پہاڑ سر کر لئے ہوں اور ایک دوسرے کو بتایا بھی نہ ہو؟ ہم نے ہمیشہ ایک مطلبی تعلق رکھا۔“ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ قیس چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”تم نے شاید نہ کیا ہو لیکن میں نے یہ سب کیا ہے۔ آج تم آزاد ہو ورنہ براق حنیف کے پینٹ ہاؤس میں کس حیثیت سے رہ رہیں ہو تیں تم جانتی ہو؟“

”میں ان لمبے قصوں میں نہیں پڑھنا چاہتی۔“ شیزل نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکا۔ ”جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اب آگے بڑھیں؟“

”یعنی ہم ایک بار پھر کاروبار کریں، ناپ تول کریں؟“ شیزل کو لگا جیسے وہ مسکرایا ہو۔ ”ٹھیک ہے پھر کرتے ہیں کاروبار کہو کیا کہنے آئی ہو؟“

اسی لمحے ملازم ٹرائی گھسیٹ کر لے آیا۔ چائے، کافی، کھانے پینے کے کافی لوازمات سے بھری ہوئی اس ٹرائی کو دیکھ قیس کو خیال آیا وہ کتنے وقتوں کا بھوکا ہے۔ اکیلے کھانا کھانا کہاں پسند تھا اسے؟

”کھانے کی تیاری کرواؤ، میڈم کھانا کھا کر جائیں گی۔“ قیس نے ملازم سے کہا۔

”نہیں میں جلدی میں ہوں، دیر ہو جائے گی۔“

”اکیلے کھانا نہیں کھایا جاتا مجھ سے جو اُن کر لو پلیز؟“ وہ اس انداز سے بولا کہ شیزل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ واقعی اکیلے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ کالج سے لے کر اب تک وہ کسی نہ کسی کو ساتھ شامل کر لیتا تھا۔ بانٹ کر، کسی کو ساتھ بٹھا کر کھانا اسکا محبوب مشغلہ تھا۔ ”بختیار چچا سے کچھ نہیں کہا تھا میں نے، ہاں میرہ کو نکالا تھا لیکن اسے بھی اسکے باپ کے گھر بھیجا تھا۔ دیکھو چچا بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا احساس ہی نہیں کیا۔“ وہ ایسے شکوہ کر رہا تھا جیسے شیزل اور اسکے درمیان کچھ آیا ہی نہ ہو۔ ”تمہارے پاس وقت ہوا کرے تو آجایا کرو۔ ساتھ کھانا کھالیں گے۔“

”قیس“ وہ اسکے نام پہ زور دے کر بولی۔ ”مہدی کا قتل کس نے کیا تھا؟“

”تم مجھ سے اعتراف جرم کروانے آئی ہو؟“ وہ ہتھیلی تلے ٹھوڑی ٹکائے دلچسپی سے بولا مگر انہوں نے یہ کچھ مختلف آدمی تھا اسکی مسکراہٹ خالی تھی۔ آنکھیں ہرچمک سے خالی۔ کوئی روگ تھا جو اسے اندر ہی اندر نگل رہا تھا۔ ”میں نے قتل کروایا تھا اب بتاؤ کیا کروگی؟“

”یہ سچ نہیں ہے۔ کیونکہ مجھ اس سب میں براق کی involvement حد سے زیادہ نظر آرہی ہے۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”ماننا پڑے گا تعلق ختم ہو گیا باقیات باقی ہیں۔“ اسکے بے لاگ تبصرے پہ شیزل کی رنگت اڑ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ گود میں یکجا کئے، لرزش پہ قابو پایا۔ اور ایک بار پھر اسکے چہرے کی طرف دیکھا۔ اندر گڑھتی اسکی نگاہیں، شیزل نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔ ”خیر چونکہ تم نے مجھ سے فیور مانگی ہے اور چونکہ میں صرف نام کا شیطان ہوں مگر درحقیقت ایک نیک صفت انسان ہوں اس لئے میں تمہیں تمہارے ”ایکس“ کی involvement اسی کی زبانی سنا دوں گا اوکے؟“

”یعنی وہ انوالو ہے؟“ اسکے دل کو کچھ ہوا۔

”مجھے کیا پتہ؟ تم کہہ رہی ہو تو ہو گا۔ تمہارے تعلقات رہ چکے ہیں اس سے۔“

”تمہارے بھی تو تعلقات رہے تھے زینیا سے پھر تم اس حد تک کیسے گر گئے؟“ سیاہ آنکھوں والی لڑکی کی آنکھوں میں طیش تھا۔ ”میں تمہیں دیکھتی ہوں اور مجھے یقین ہی نہیں آتا تم وہی انسان ہو جس سے میں ملی تھی تم نے زینیا۔۔۔۔۔“

”میں اسے بہت یاد کرتا ہوں۔“ اسکی بات کاٹ کر بے حد مدھم لہجے میں شکستگی سے اعتراف کیا۔ ”بہت غلط کیا ہے میں نے یقین آگیا ہے مجھے۔ پتہ نہیں کب، کیسے، کیوں کر دیا میں نے یہ سب؟ مجھے نہیں سمجھ آ رہی کچھ بھی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ گر ادیا۔ وہ تھک کر گر گیا ایسے جیسے پہاڑ کھڑے کھڑے گر جاتے ہوں۔ ”وہ میرے سامنے نہیں ہے اور میرے لئے ایک ایک منٹ ایک عذاب ہے۔ مجھے جتنے لوگوں نے چھوڑنا تھا وہ چھوڑ دیتے فرق نہیں پڑتا لیکن وہ صرف ایک انسان نہیں ہے۔ مجھے وہ واپس چاہیے ہر صورت۔“ اس نے چہرہ اٹھایا آنکھیں گیلی سی تھیں۔ اتنے دنوں کی فرسٹریشن، بے سکونی عنقا ہونے لگی۔ وہ بھر بھری دیوار کی مانند ڈھے گیا۔ شیزل دم سادھے اسے تک رہی تھی۔ اسے پہلی بار کسیر محل سے باقاعدہ وحشت ہو رہی تھی۔

”مجھے یہ نہیں پتہ وہ کہاں ہے لیکن شاید ایک انسان کو پتہ ہو۔ اس سے لاکھ اختلاف سہی، میں اسے واپس لاؤں گا تا کہ وہ اسے واپس لائے جس کے بغیر میں "میں" نہیں۔“

”وہ انسان کون ہے۔؟“ آگے کو ہو کر اس نے سوال کیا۔

”وہی جسے راستوں کا علم ہے۔“

”مہدی؟“ اسکی آواز کسی کھائی سے آتی تھی۔

”یعنی رہبر۔“ قیس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ شیزل کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ کیا کہتی یہ نیم دیوانہ شخص جس سراب کے حصول میں تھا وہ اسے اس دنیا میں نہیں ملنے والا تھا۔ صحرا میں سمندر دیکھ لینے سے تاثیر نہیں مٹی۔

”تمہیں تھیراپی چاہیے قیس تمہیں واقعی ضرورت ہے۔“ وہ بے حد مخلصی سے اسے مشورہ دے رہی تھی۔

”لے رہا ہوں تھیراپی۔“ وہ تابعداری سے بولا۔ ”کل سے پہلا سیشن ہو گا۔ میں بدل رہا ہوں یار۔“ وہ ایک بار پھر لاجواب رہ گئی۔ قیس کمبیر پرت در پرت کھل رہا تھا۔ اور وہ اسکے اس روپ کی عادی نہیں تھی۔ وہ کیسے اپنی محافظ پرسنالٹی میں کسی کو داخل ہونے دے رہا تھا۔ وہ بدل رہا تھا یا بے حد اکیلا تھا؟

”سر کھانا لگ گیا ہے۔“ ناک کرنے کے بعد ملازم نے دروازے پہ دستک دی۔ قیس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ اور اسے جانے کو کہا۔

”دیکھو کمبخت کو کیسے جھوٹ گڑھ رہے ہیں۔ ابھی دیکھ کر آیا تھا میں چولہے ٹھنڈے پڑے تھے اب کیا فوراً کھانا بن گیا۔ فریج میں پڑا کھانا گرم کر دیا ہو گا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”آؤ چل کر کھاتے ہیں رزق کی بے حرمتی نہیں کرتے۔“

وہ اٹھ کر اسکے ساتھ چلنے لگی۔ وہ جو ذرا اسی بات پہ ملازمین کی باز پرس کرتا تھا آج خاموش رہا۔ کافی دیر بعد سربراہی کرسی پہ بیٹھے وہ انتہائی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ شیزل بس کھانے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کھا نہیں سکی۔ یکدم یہ گھر اس بوڑھی حویلی کی مانند لگنے لگا جس میں کئی لوگوں کو ایک ساتھ قید کر دیا جاتا تھا

ہے۔ مگر اس بار اس کہانی میں، اس بوڑھی حویلی میں کیوں دیوہ ترس آ رہا تھا؟ بے تحاشا ترس۔ کوئی اسے پروں میں سمیٹ لے۔ کاش۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا تھا جب پورے ڈھائی ماہ بعد وحید اللہ نے واپس ڈھاکہ میں قدم رکھا۔ ہواؤں نے اسے پہلے کی طرح خوش آمدید کہا۔ لوگ اس سے پہلے کی طرح خوش اخلاق رہے۔ کھانوں کی مہک نے یونہی ایک نروٹھی سی مہک انکے نتھنوں تک پہنچائی، یہ اشارہ تھا کہ یہاں اس شہر میں انہیں یاد کیا گیا۔ پندرہ سال سے وہ اس شہر سے کراچی تجارت کر رہے تھے۔ آج انہیں ڈھاکہ اور کراچی کے درمیان سرحدیں دکھنی ختم ہو گئیں تھیں۔ آج انکے کراچی جتنے تعلقات اور رشتے یہاں بھی تھے۔

راشدی ہاؤس کے باہر کھڑی ایک ٹیکسی میں کچھ سامان رکھا جا رہا تھا۔ کھڑکی میں کھڑی زینیا حاکم کے چہرے پہ اگر خوشی نہیں تھی تو غم بھی نہیں تھا۔ ملک واپس جانا ہر ایک کے بخت کا حصہ نہیں ہوتا مگر اس نے اپنا بخت خود لکھا تھا اپنے ہاتھوں سے۔ اسے یہاں سے نجات مل رہی تھی۔

”تم بہت ڈھیٹ ہو زوہرا۔“

”زینیا...“ اس نے بغیر لب ہلائے تصحیح کی۔ ”بجائے اس کے کہ تم یہ مان لو کہ تمہارے آدھے خاندان نے تمہیں یہاں پہنچانے کے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں تم ہر شے سے نظر چرا کر بھاگ رہی ہو؟“

یہ قربانی نہیں پیچھا چھڑانا تھا میں نے سے کچھ مانگا نہیں تھا۔“

نیا گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ اسکی صبح پیشانی پہ تفکر کی لکیریں تھیں۔ ”وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا زوہرا۔ جس انسان نے حکومت کی ہو اس سے تخت لے لیا جاتا ہے۔ جس نے محبتیں دیکھی ہوں اسے خالی دامن کر دیا جاتا ہے۔ یہ امتحان ہوتا ہے۔ انسانوں کو اس امتحان پہ کھرا اترنا ہوتا ہے۔“

”ہر انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ انسان یہ سب ڈیزرو نہیں کرتے۔“

”حضرت آدم تک جنت سے نکالے گئے تھے۔ کیا وہ یہ سب ڈیزرو کرتے تھے؟ کیا وہ اللہ کو عزیز نہیں تھے۔“ بنگالی عورت اسکی جرح پہ اتر آئی تھی۔

زینیا نے انہیں ایک الگ ایک نئی نظر سے دکھا۔ ”میں نے انسانوں کو پرکھا ہے۔ وقت کو دیکھا اور جھیلدا ہے۔ میں جانتی ہوں لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی اس گھر میں رہو واللہ میں چاہتی ہوں تم کہیں چلی جاؤ تا کہ مجھ پہ زیادہ ذمہ داریاں نہ آئیں۔ لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تم ایک آئریبل زندگی گزارو۔ زینیا انکے آخری الفاظ پہ تھم سی گئی۔ کافی دیر بعد وہ ہلکی آواز میں بولی۔

”میرے بارے میں سوچ رہی ہیں؟“

”نہیں میں اتنی عظیم نہیں ہوں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے تمہارے بہن، بھائی نے تمہارے لئے بہت قربانی دی ہے۔ وہ رائیگاں چلی جائے گی۔ میری طلاق کے وقت میرے بہن بھائی میرے ساتھ نہیں تھے کیونکہ انکو لگتا تھا سب کو اپنے مسئلے خود فکس کرنے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا تو نیما راشدی ایک مختلف انسان ہوتی۔“

زینیا جو اب کچھ نہیں بولی۔ وحید اللہ نے ہاتھ ہلا کر اسے نیچے بلایا وہ فوراً اپنا بیگ اٹھا کر کمرے کی چوکھٹ پار کر گئی۔ نیا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ آنے والوں نے جانا ہی ہوتا ہے یہ تو طے ہے۔

تیسری منزل سے پہلی منزل کی طرف جاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ آج سیاہ ماربل کی وہ سیڑھیاں معمول سے ہٹ کر صاف تھیں۔ نیما کی بڑی بھابی کو بلاخر یہ خیال بھی آ ہی گیا۔ پہلی منزل کے صحن میں بختاور ہمیشہ کی طرح پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔ زینیا نے ایک نظر اسے بھی دیکھا۔ چند ماہ کے دوران ہی وہ ان سب کے معمولات سے واقف ہو گئی تھی۔ گھر کا دروازہ پار کرتے ہوئے سوسائٹی کے بڑے سے میدان میں آج بچے کم نظر آئے اسے۔ فوجی کٹ بالوں والا بچہ بھی آج کرکٹ کھیل رہا تھا ورنہ ہر بار اسے کچا بسکٹ کر کے ایک طرف بٹھایا جاتا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دائیں طرف والے ڈبل سٹوری گھر کو دیکھا۔ آج بھی انکے گھر کی ماسی کی بیٹی بالکنی میں کھڑی ٹک ٹاک بناتی نظر آرہی تھی۔ اسے آج پھر وحیدہ سے ڈانٹ پڑنی تھی۔

وہ جو خود کو اس ملک، اس شہر میں مس فٹ گردانتی تھی کوئی اسے بتائے دنیا کے وجود میں آنے کے بعد یہ نہیں کہا گیا فلاں حصہ مسلمانوں کا ہے فلاں یہود کا، فلاں پارسیوں کا اور فلاں یسوع مسیح کے ماننے والوں کا۔ یہ اراضی کا قطعہ اللہ نے انسان کے حوالے کیا اور اسے حق دیا کہ جہاں چاہے بس جائے۔ یہ عارضی ٹھکانہ تھا۔ یوں بھی اسکی واپسی کہیں اور تھی۔ وہ جو اسکا اصل ٹھکانہ تھی۔

”کیا تمہیں کھانا نہیں ملا؟“ ٹیکسی چل پڑی تھی جب اسکے سامنے والی نشست پہ بیٹھے وحید اللہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”سانس لینے کو ہوا پوری نہیں تھی یا قدم دھرنے کو زمین تنگ پڑ گئی تھی؟“

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“

”تمہاری واپسی صرف ان تین بنیادوں پہ ہونی چاہیے تھی لیکن اگر یہ سب مل گیا تو یہ خود غرضی ہے جو تمہیں واپس لے کر جا رہی ہے۔“

”اگر آپ کو اٹھا کر کسی دوسرے ملک، غیر لوگوں کے درمیان بھیج دیا جائے تب میں آپ سے پوچھوں گی کیا خود غرضی ہے اور کیا ہے اپنے اصل کی طرف واپس۔“

”میں کئی دن سمندری سفر میں اپنوں سے دور غیر ملک میں رہتا ہوں۔ کیونکہ اس دوران مجھے میرا رزق ملتا ہے۔ یہ میرا اصل ہے۔ تمہارا اصل کیا ہے؟“ وہ جیب میں انکی عینک کے شیشے ٹشو سے صاف کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ زینیا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ”تمہارا اصل ہے ناشکر اپن۔ خود غرضی۔ حالات سے فرار۔ ڈھٹائی۔ تم رشتوں کی قدر نہیں کرتیں۔ تم کسی چیل کی طرح اپنے قریبی لوگوں کو نوچتی ہو کیونکہ تمہیں لگتا ہے یہ تمہارا حق ہے۔“ غصے سے اسکے ہاتھ کی مٹھی بھیج گئی۔ الفاظ نئے نہیں تھے مگر انہیں پہلی دفع کہنے والا وہ تھا جو بولتا تھا تو ہوائیں رک کر سنتی تھیں۔ اس جاچکے کی یاد ایک بار پھر ہوا میں رچ بس گئی۔ ”وہ بیچارہ افسر تمہارے لئے پیشیاں بھگتا رہا ہے۔ تمہاری دوست میڈیا اور پولیس کے جواب دے دے کر ہلکان ہو گئی ہے۔ تمہارا بھائی پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہا ہے لوگوں کے گریبان پکڑ رہا ہے اور تم؟“ انہوں نے صاف عینک آنکھوں پہ چڑھائی اب ڈھاکہ صاف اور واضح دکھ رہا تھا۔ مگر صرف انہیں۔ عقبی نشست والی لڑکی کے لئے ڈھاکہ مزید دھندلا ہو گیا تھا۔

”تم جانتی ہو تم یہاں سے کیوں جا رہی ہو؟“

”کیوں؟“ وہ لہجے کی نمی پہ قابو پاتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

”کیونکہ تم گھبراتی ہو۔ تمہاری زندگی کا زانچہ دیکھ آیا ہوں۔ ہر دور میں تمہارے ساتھ لوگ کھڑے تھے اب اکیلی ہو اور اندر سے تم عام، مڈل کلاس لڑکی ہو جسے سہارے چاہیے تھے۔ نہیں مل سکے۔ جو شہزادے کے انتظار میں ہے کہ وہ کب کانچ کا جو تالے کر آئے گا اور اسے تمہارے پیروں کی زینت بنائے

گا۔ ”گاڑی پورٹ سے ذرا فاصلے پہ آ کر رکی مگر شور ایسا تھا کہ یہاں تک کان کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ زینیا تو صرف وحید اللہ کو سن رہی تھی باقی ساری آوازیں غیر معنی تھیں۔

وحید اللہ گاڑی سے باہر نکل آئے۔ زینیا بیگ سینے سے دبوچے وہیں بیٹھی رہی۔ کیا کرنے جا رہی تھی وہ؟ کیا تھی اسکی زندگی۔ کیا وہ واقعی نہیں جینا چاہتی یا وہ کوشش سے ڈر رہی ہے۔ مسائل سے پہلے اسکے پاس حل آتے تھے پھر آج کیوں وہ تردد کا شکار تھی۔ ایک فیصلہ صرف ایک فیصلہ کرنے میں وہ اتنی متاثر کیوں تھی؟ کیا تھا جو اس ملک میں اسکا منتظر تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔

”باہر آ جاؤ زینیا حاکم۔“ وہ گویا کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ یہ نام اسے اس نام سے خوف آیا۔ اگر کسی نے سن لیا، کوئی اس نام سو واقف ہو تو؟ وہ اسی طرح ہر اسان نگاہوں سے آس پاس دیکھتے ہوئے باہر نکل آئی۔ چند پل بعد وہ وحید اللہ کے ساتھ لوگوں کے درمیان راستے بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے احساس ہوا یہ کام مشکل تھا۔ ڈھاکہ کی رش میں راستے بنانا بہت مشکل تھا۔ سمندر کے کنارے کئی بحری جہاں کھڑے تھے۔ لوگ چڑھتے اترتے دکھائی دے رہے تھے۔ زینیا کی نگاہیں بھٹک کر ان تین جہازوں پہ جا کر اٹک گئیں جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ تینوں تین منزلہ فیری جہاز تھے۔ جن پہ ڈھاکہ کے سمندر کے چکر لگوائے جاتے تھے۔ مقامی زبان میں انکے ماتھے پہ انکا نام درج تھا اور لوگ چڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف گول گپے، بریانی اور کئی کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والے لوگ کھڑے تھے۔ سب یکدم غیر لگنا بند کیوں ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا۔

”ہم کتنی دیر میں نکلیں گے؟“

”جانتی ہو میں آج تک سوچتا ہوں شہزادے نے آخر شہزادی کو کالچ کا جوتا کیوں پہنایا؟“ اس شور میں انکی آواز اور اس بے تکی بات پہ زینیا الجھ گئی۔ ”جوتا ٹوٹ جاتا تو شہزادی کے پاؤں زخمی ہو سکتے تھے مگر شہزادے کو بس اپنی پرواہ تھی۔ وہ بس اپنی محبت میں اسے لینے آیا تھا۔ اگر اسکی جگہ شہزادی کا باپ ہوتا تو وہ چاہے اسے ٹاٹ کا جوتا دیتا، لیکن پائیدار اور نرم جوتا نہ دیتا۔“ سارے کے سارے ڈھاکہ نے منہ پہ انگلی رکھ کر سکوت اختیار کر لیا۔ زینیا نے اگلا سانس تک روک لیا۔

”باپ کو اولاد کی فکر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اسے سخت جوتی دیتا ہے۔ جو اسے گرمی، سردی، دھوپ سے بچاتی ہی ساتھ اسے یہ سبق دیتی ہے کہ ایک روز اس جوتی کی جگہ اسے نرم جوتی پہننی ہے۔ باپ دور اندیش ہوتا ہے۔ شہزادے کی جگہ اگر باپ ہوتا تو وہ شہزادی کو محض اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتا وہ اسے اپنے تک آنے کا راستہ دکھاتا۔ اس دنیا میں جو قربانی ایک باپ دے سکتا ہے وہ کوئی نہیں دے سکتا۔“ سنہری آنکھیں ایک نقطے پہ ساکت تھیں۔ وحید اللہ سمندر کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ کسی کو نہیں دیکھ سکی۔

”یہ زندگی مشکل ہے لیکن اسے تمہارے لئے تمہارے باپ نے چنا ہے۔ کسی بشر نے نہیں، کسی قیس کسیر، کسی مہدی نے نہیں۔“ وہ بے دھم ہو گئی۔ بے سانس، خالی۔ ”اسے تم پہ اعتبار اور ناز تھا۔ اسے لگا تھا تم یہ سب جھیل سکتی ہو۔ تم جگہ بنا سکتی ہو اور مسائل کے حل بھی نکال سکتی ہو لیکن بیچارہ“ اس نے تاسف سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ ”شاید اسے معلوم نہیں شہزادی اب کسی شہزادے کی راہیں دیکھنے لگی ہے۔“

وہ پیچھے کی طرف قدم لے رہی تھی۔ اسکا چہرہ وہ نہیں رہا تھا جس کے ساتھ وہ آئی تھی۔ وحید اللہ اسکے پیچھے نہیں گنا۔ زینیا میکانیکی انداز میں پورٹ کے باہر کھڑی ٹیکسیوں کی طرف گئی۔ اس نے سوسائٹی کا نام کہا اور

ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ گاڑی وہیں آکر رکی جس جگہ کو وہ پیچھے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ کسی مانوس انداز میں گھر کی طرف آئی۔ نیما راشدی نے اسکے لئے دروازہ کھولا سامنے زینیا حاکم تھی۔ اسکے چہرے پہ حیرت نہیں تھی۔ مگر کچھ عجیب سا تھا۔

”زوہرا تم“

”زوہرا متین۔“ اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔ ”یہ میرا نام ہے۔“ انداز رو بولک رہا۔ نیما نے اسکے لئے دروازہ کھول دیا۔ زینیا حاکم کی واپسی مضبوط قدموں اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ وہ زینیا نہیں تھی جو اس گھر سے گئی تھی۔

سفید کمرے میں شیشہ آنکھوں کے آگے لگائے، شرٹ سے خالی بالوں سے بے داغ، مگر زخمی سینے کو دیکھتے ہوئے اس نے کتنا وقت گزار دیا تھا خبر نہیں ہو سکی۔ باہر ہنوز خاموشی تھی۔ کسی نے ان دیواروں کو واپس سفید رنگ میں نہیں بدلا تھا۔ کسی نے اس سے آئینہ نہیں چھینا تھا۔ مہدی کو اپنی آزادی اب بہت قریب نظر آرہی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا اسکی موت بے حد قریب تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں دیکھیں، پھر ان آنکھوں میں کوئی اور منظر غالب آیا۔ رفتہ رفتہ اس نے مہدی کی آنکھوں پہ غلبہ پالیا۔ سفید کمرے کے اس بے رونق منظر سے پرے کسی چمکیلی دوپہر کا ذکر ہے۔ وہ پرچہ دے کر باہر نکلی تو سامنے گاڑی کے اندر مہدی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پھر اپنے آس پاس دیکھا۔ کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ زینیا آگے نہیں

آسکی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اسی لمحے اسکے ہاتھ میں پکڑا موبائل بجا۔ مہدی اسے کال کر رہا تھا۔ زینیا نے چونکتے ہوئے کال اٹینڈ کر لی۔

”آپ کے لئے کھڑا ہوں سرکار، یہاں آنے کی زحمت کر لیں۔“ چند دن قبل بھی اسکا ایک پیپر تھا اور شیزل اسے لینے آئی تھی۔ آج مہدی آیا تھا۔ ماننا پڑا کہ اسلام آباد نے اسے چند اچھے لوگ بھی دیئے تھے۔

”اگر میرے لئے آئے ہوتے تو آپ باہر کھڑے ہوتے آپ گاڑی کے اندر بیٹھے ہیں کبیر صاحب۔“

”وہ اس لئے سرکار کیونکہ باہر کھڑا رہتا تو آپ کے سر تاج پہ کسی کا دل آسکتا تھا۔ اور ہم ٹھہرے صدا کے وفادار انسان۔ آپ کے علاوہ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا ہو گا میرا؟“ وہ گاڑی کے شیشے کے پار اسے تکتے ہوئے مسکرایا۔ زینیا اسی طرف آرہی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے اسکی چھوٹی آنکھیں مزید چھوٹی ہو گئی تھیں۔ چہرہ سرخ مہدی غور سے اسکے بدلتے رنگ اذہر کرتا رہا۔

”آپ کی رنگین مزاجی کے چرچے نہ ہوتے تو کسی کی جرات کوئی آپ کو دیکھے؟“

”یعنی یہ بھی میرا قصور ہے؟“

”/ صوفی صدمہ۔“ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا۔ اور فرنٹ سیٹ پہ آکر بیٹھی۔ دونوں فون کان سے لگائے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں چمک اور لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ دنیا میں کئی خوبصورت مناظر ہیں مگر دو محبت میں مبتلا لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا ان تمام مناظر پہ بھاری ہے۔

”اچھا لڑکی، میں فون رکھتا ہوں فرنٹ سیٹ پہ میری بیوی آگئی ہے۔ بہت شکی مزاج خاتون ہے وہ۔“

”بیوی کے لئے چھوڑ دیں گے مجھے؟“ وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ آنکھوں میں محفوظ کن تاثر تھا۔

”میری بیوی کو دیکھا ہوتا تو یہ نہ کہتیں تم۔ اسکے لئے دنیا چھوڑی جاسکتی ہے۔“

”اچھا لیکن میں نے سنا تھا آپ کی بیوی کافی بد زبان، اکھڑ اور ڈرامے باز واقع ہوئی ہے۔“

”یہ تو اسکے پارٹ ٹائم مشغلے ہیں۔ ورنہ وہ فل ٹائم، حسین، جان جہاں، رونق محفل اور نور دنیا ہے۔“

زینیا سرخ چہرے کے ساتھ ہنس پڑی، مہدی بھی ہنسنے لگا۔ ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے موبائل انہوں نے کان سے نہیں اتارے۔ وہ آنکھوں کی چمک، وہ چہرے کے رنگ کیا ہے جو انہیں مات دے جائے۔ اس لمحے ان دونوں کے دلوں کو یہ احساس ہوا ایسے زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ یونہی خوا مخواہ ہنستے ہوئے، اس طرح روبرو، ہر فکر سے آزاد۔

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ بد تمیز خاتون آپ کو آئے روز بلاک بھی کر دیتی ہے۔“

”کسی نے تمہیں یہ نہیں بتایا اسکی بلاک لسٹ سے بار بار انبلاک ہونے والا واحد شخص میں ہوں۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”یعنی آپ کو بہت سرچڑھا رکھا ہے اس نے؟“

”ہاں بس ذرا سا وقت بعد میں سر سے دل تک آجاؤں گا، مشن مکمل۔“ اب کے اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ زینیا ٹھہر گئی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ مہدی کمبیر نے زینیا حاکم کے دل کے دروازے ایک مدت ہوئی پار کر لئے تھے۔ اور اب دل کی گدی پہ وہ پورے استحقاق سے براجمان تھا۔ وہ لا علم تھا، یا بس لگتا تھا؟

”فون رکھتی ہوں میں، آپ نے ویسے بھی بیوی کے گن ہی گانے ہیں۔“

”ہاں رکھ دو، وہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔ اسے دیکھوں یا تم سے بات کر کے وقت ضائع کروں؟“ مہدی نے فون گود میں دھر دیا زینیا جو کچھ کہنے والی تھی مہدی نے اس کے کان سے فون اتارا اور اسے بھی اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے برا نہیں منایا۔

”اور بتائیں بیگم کیا کھائیں گی؟“

زینیا نے بے اختیار رخ بدلاتھا۔ چہرہ گلابی ہو گیا۔ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑتی مگر مہدی کمبیر دومنٹ کے اندر اندر اسکی زبان تالو سے چپکا دیتا تھا۔ ”بیگم شرمالیا ہے تو اب بتائیں کیا کھائیں گی؟ آپشن میں میرا کچا گوشت available نہیں ہے۔ کچھ پینا ہے تو میرا خون حاضر ہے۔ اجازت کی ضرورت تو تمہیں کبھی پیش ہی نہیں آئی۔“

”آپ کچھ زیادہ فری ہو رہے ہیں۔“ زینیا نے اپنا بیگ کھول کر سو سو کے چند نوٹ نکال کر اسکی گود میں رکھے۔ ”اب پورا راستہ آپ میرے ڈرائیور رہیں گے۔“ مہدی نے ایک نظر اسکے دیے پیسوں کو دیکھا، پھر اسے اور کھکھلا کر ہنس پڑا۔ بے اختیار اسے کچھ یاد آیا۔ وہ قیسم کی راہداری میں کھڑے تھے مہدی نکاح کے بدلے اس سے اپنا ورلڈ ٹور اسپانسر کرنے کو کہہ رہا تھا زینیا نے اسکی ہتھیلی پہ چند سکے رکھے۔ وہ دونوں سیکریٹ اسکائے میں تھے مہدی نے اس سے کچھ کہا اور زینیا نے میز پہ اپنی طرف کا بل رکھا وہ پیسے مہدی اٹھا چکا تھا۔ وہ دونوں سڑک پہ کھڑے تھے، مہدی اسکا ڈرائیور بننے کو تیار تھا جب زینیا نے اسے چند سو تھمائے، اور آج وہ اسے دوبارہ کچھ روپے دے رہی تھی۔ وہ ہنستا چلا گیا۔ زینیا گہری سانس لے کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کمبخت کو کوئی بتائے وہ ہنستے ہوئے پیارا لگتا ہے اور دل کرتا ہے اسے دیکھا جائے۔ یونہی ہنستے ہوئے اس نے پیسے ہمیشہ کی طرح سینے والی جیب میں رکھے۔ انکی جگہ یہیں تھیں۔

”میڈم آپ بہت خوبصورت ہیں، کیا ڈرائیور کو تھوڑا فلرٹ کرنے کا حق ہے؟“

”نہیں، میرا ایک عدد شوہر ہے اور وہ کہتا ہے زینیا حاکم سے فلرٹ نہیں کیا جاسکتا۔“ اس نے اپنا موبائل مہدی کی گود سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”سرکار، یوں نہ کریں۔ دل بہت کمزور ہے میرا میں نے رخصتی کروالینی ہے۔“

زینیا نے پلٹ کر گھور کر اسے دیکھا۔ مہدی کی چلتی زبان کو بریک لگے۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیر کر ہلکا سا مسکرایا۔ زینیا یونہی اسے ٹھنڈی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ”آنکھوں سے ہلاک ہونے کا کوئی آپشن نہیں ہوتا سرکار؟ تھوڑی دیر ہلاک کر دیں ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ایسی معصومیت سے بولا کہ زینیا نے مسکراہٹ دباتے ہوئے رخ موڑ لیا۔ یہ آدمی، اسکی باتیں، اسکی سنگت وہ زینیا حاکم کو اندر تک سرشار کر سکتا تھا۔

منظر دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔ اور حقیقت نظر آئی۔ وہ حقیقت جس میں ”وہ“ نہیں تھی۔ وہ اتفاق بن کر آئی تھی۔ محافظ خود بینی، مرہم قدرت کی طرف سے، اور محبت؟ اس سے محبت بخت کی طرح مہدی کسیر کے دل پہ نقش کر دی گئی۔ ایک ایسا نقش جسے وہ قابل تعظیم سمجھتا تھا۔

دروازہ چر کی آواز کے ساتھ اور کھلتا چلا گیا۔ زر قون، سپاٹ چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اسکی آنکھیں بے تاثر تھیں اور لب سیدھی لکیر میں بند۔ چہرے پہ سپاٹ تاثر تھا۔ مہدی نے اسے دیکھا اور اسے بے اختیار کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ زر قون کے ہاتھ پہ زنجیر بندھی تھی۔ جسے اب وہ کلائی پہ لپیٹ رہا تھا۔ مہدی دھیرے دھیرے پیچھے ہونے لگا۔ آئینے پہ اسکی گرفت سخت ہوئی۔ زر قون نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کونے میں لگے سی سی ٹی وی کیمرہ کو۔ وہ دو قدم آگے آیا۔ جھک کے سنگ مرمر کا وہ سفید مگ اٹھایا اور مہدی کو دیکھتے ہوئے اس مگ کو اچھال کر کیمرہ کے عین اوپر دے مارا۔ اسلام آباد کے اس

رئیس کے لئے اس سفید کمرے کا منظر بلاک ہو گیا۔ ختم ہو گیا۔ سنگھار میز کے سامنے کھڑے کسی اسپیشل ملاقات کے لئے تیار ہوتے براق حنیف کے لبوں پہ کرب زدہ تبسم ابھرا۔

”میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن قسمت کے لکھے کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔“ شانے اچکائے اور اپنے اوپر پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا۔ جانے والوں پہ کیا رونا؟ ”میں تمہیں بہت مس کروں گا مہدی، اور میں یو نہی نہیں کہہ رہا۔“

”ہم اتنے دن آپس میں لڑتے رہے، جھگڑتے رہے لیکن ہم نے ایک بار بھی بیٹھ کر بات نہیں کی۔ ہمیں بات کرنی چاہئے نا؟“ سفید کافان والا مرد اسکے قریب بیٹھ گیا۔ مہدی نا محسوس انداز میں اس سے دور ہٹا۔ اسے کچھ کھٹک گیا تھا۔ ”براق اور میں ساتھ کام کرتے ہیں۔ چائنا سے آنے والا کپڑا میں اسکے ٹیکسٹائل کو بھیجتا ہوں۔ تم مجھے ایک تاجر کہہ سکتے ہو۔ لیکن اس مقام تک مجھے براق لایا اس لئے تم مجھے اسکا غلام کہہ سکتے ہو۔ تمہیں یہی کہنا چاہیے۔“ اس نے گردن ترچھی کر کے مہدی کو دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں خوف تھا۔ ”ڈرومت میں ایک نارمل بات کر رہا ہوں۔“ اس نے مہدی کے گلے میں گلی ابھرتے دیکھ کہا۔

”میرے ابا تمہارے باپ کی فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ میں بچہ تھا ساتھ جایا کرتا تھا۔ میری ماں بھی وہیں کام کرتی تھیں۔ فیکٹری کے ایک ملازم نے میری اماں کے ساتھ بد تمیزی کی ابا کو غصہ آیا وہ لڑنے پہنچ گئے مگر انکے دیئے ہوئے دھکے سے آدمی گرا اور اسکا سر بھاری شے سے ٹکرایا۔ آدمی مر گیا۔ اچھا ہوا۔ ہے نا؟“ اس نے مہدی سے تائید چاہی۔ اس نے محض سر ہلادیا۔ ”تم خود سوچو کوئی تمہاری بیوی سے ایسی بات کرے تم کیا کرو گے؟“

مہدی کئی لمحے خاموش رہا۔ پھر جب بولا تو اسکا لہجہ مستحکم تھا۔

”اول تو میری بیوی یہ مسئلہ لے کر میرے پاس نہیں آئے گی۔ دوئم اگر وہ آگئی تو وہ آدمی ”غلطی“ سے نہیں مرے گا۔“

زر قون ہنس پڑا۔ تو صیفی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تمہارے باپ نے اس قتل پہ میرے ابا کو جیل کروا دی۔ کیونکہ انکو لگتا تھا ہر جرم کی ایک سزا ہوتی ہے اور اس جرم کی سزا قتل نہیں تھا۔ خیر قصہ مختصر ابا کو جیل ہو گئی۔ اماں کو لوگ باتیں سنانے لگے اور انہوں نے تنگ آ کر ایک دن خود کشی کر لی۔ پیچھے چار بچوں کی ذمہ داری مجھ پہ آگئی۔ بہت براہو اپارٹ ٹو ہے ناں؟“ مہدی کچھ کہہ نہیں سکا۔ ایک لمحے کے وہ جیسے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ”تمہارے ابا چاہتے تو میرے باپ کی مدد کر سکتے تھے۔ چاہتے تو میری اماں کو نوکری سے نہ نکالتے۔ اس کے بعد میں نے بہت مشکلات دیکھیں۔ برا وقت کاٹا۔ کیا کیا نہیں دیکھا میں نے؟ بس دل میں ایک عہد پکا تھا۔ ایک دن میں سرور کسبیر کی اولاد کو خون کے آنسو رلاؤں گا۔ اور یہ موقع بھی مجھے براق نے دیا۔ جس کے لئے میں ساری زندگی انتظار کرتا رہا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ مہدی اپنی جگہ جامد ہوا۔ آنکھیں ایک پتلی پہ ساکت ہوئیں۔ ”دیکھو مجھے کیسا گولڈن چانس نصیب ہوا ہے“ وہ مسکرایا۔ ”اپنی موت کے لئے تیار ہو؟“

”مجھے مارنے کی کوشش بھی مت کرنا، زندہ گاڑھ دوں گا۔“ وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کر گیا۔ زر قون نے ہاتھ پہ لپٹی چین کھولی۔ چند ثانیے مہدی کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک زوردار تھپڑ اسکے چہرے پہ دے مارا۔ اسکی گردن تک ٹیڑھی ہو گئی۔ مگر طیش ایسا تھا کہ اس نے اٹھ کر ویسا ہی تھپڑ زر قون کو مارا۔

”تمہاری یہ جرات کہ تم مہدی سرور کسبیر پہ ہاتھ اٹھاؤ گے؟ میرے چہرے پہ ہاتھ اٹھاؤ گے؟“ وہ غراتے ہوئے اس پہ جھپٹا مگر زر قون نے اسکی کہنی پکڑ کر اسے مروڑا اور پیچھے تک لے گیا۔ اسکی کمر پہ گھٹنہ دے

مارا وہ گر پڑا اسی لمحے زر قون نے کلائی پہ لپٹی زنجیر اسکی گردن پہ باندھ دی اور دباؤ بڑھایا۔ اسی پل اسکے کان میں لگے ایک آلے میں کوئی آواز گونجی۔

”زر قون . . . اسے مت مارنا۔ مہدی کسیر کو زندہ چھوڑو۔ اسے ہاتھ بھی مت لگانا تم سن رہے ہو؟“ پھولی سانسوں کے درمیان براق حنیف کہہ رہا تھا۔ زر قون کی گرفت اسکے گلے پہ ایک لمحے کو ہلکی ہوئی مگر اگلے ہی لمحے کچھ سوچتے ہوئے وہ گرفت بڑھا چکا تھا۔ وہ اس ایک چانس کو ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ کسی قیمت پہ نہیں۔

سفید کمرے کے اس اسیر کے لئے موت پنچے پھیلانے کھڑی تھی۔ اور وہ بہت جلد ان میں جکڑا جانے والا تھا۔



BEING THE STRING OF YOUR KITE

”یہاں سے کب جاسکتے ہیں ہم؟“ بد مزگی سے کہتے ہوئے ضیغم میر بشر حاکم کے پاس آکر بیٹھا۔ وہ جو بیڈ پہ بیٹھا بے مقصد انگلیاں چلا رہا تھا کوفت سے موبائل ایک طرف پھینکا۔

”ایف آئی آر ہے ہم پہ، کیس چل رہے ہیں تمہیں لگتا ہے ہماری جان اتنی جلد خلاصی ہو سکتی ہے؟“

”میں تھک گیا ہوں۔ یونیورسٹی کا الگ سے ضیاع ہو رہا ہے۔ نارمل زندگی کی طرف کب پلٹیں گے ہم؟“

اب ہمارے لئے نارمل زندگی نہیں ہے۔“ وہ رنج سے بولا۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا ہے؟“ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔ ”میں اتنا عقل سے پیدل کب ہوا کہ اپنی ہی بہن کو اتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ میں صرف اور صرف اسے پروٹیکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔؟“

”بشر . . . زینی بچی نہیں ہے، اور جو سب اس نے دیکھا ہے اس نے یقیناً اس پہ گہرا اثر چھوڑا ہو گا۔ اگر اسے ہم سے رابطہ کرنا ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی یہ تم بھی جانتے ہو۔ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ہمارے۔ پولیس میں ہم نہیں جاسکتے۔ میڈیا پہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر تم نے بار بار اس سے ملنے کی کوشش کی تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ تم اپنے ہاتھوں سے زینی کی محفوظ پناہ گاہ ختم کر دو گے۔ اگر واقعی ایسا کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے جاؤ کرو۔“ بشر کے چہرے پہ اضطراب تھا۔ وہ کئی دنوں سے بے چین تھا۔ اور اگلے کئی دنوں تک یو نہی رہنے والا تھا۔ وقت اس پہ مہربان نہیں تھا۔ اگلے کئی ماہ و سال نہیں ہونے والا تھا۔

”اگر واقعی اپنی غلطی سدھارنا چاہتے ہو تو ایک طریقہ ہے۔“ بشر نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ ضیغم کے گلے میں گلی ابھر کر معدوم ہوئی۔ ”تم نے ایک غلط کام کیا جو کہ تمہاری طرف سے صحیح تھا۔ لیکن غلط کام ہو جائے تو اسے صحیح کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ یا تو اس کام کو صحیح کرو چاہے جس طرح کرنا پڑے یا پھر اسکی جگہ ایک درست کام کرو۔ تم لوگوں نے ہمیشہ زینی پہ توجہ دی ہے۔ تمہاری چھوٹی بہن بھی تو ہے۔“ اسکے ذکر پہ دونوں مردوں کے کان سرخ ہوئے تھے۔ بشر لب بھینچ گیا۔ اسکا یہ بہنوئی کچھ زیادہ فری ہوتا تھا۔

”تم ہمارے گھر کے معاملات میں مت بولو۔“

”اتنی غیرت کس بات کی دکھا رہے ہو؟ ٹھیک ہے تمہاری بہن ہے لیکن میری منگیتر بھی تو ہے۔“ وہ چڑھ دوڑا۔ ”اس نے میڈیکل کا ٹیسٹ دینا تھا۔ کچھ دن بعد آخری تاریخ ہے۔ اسکا کیریئر ایسے ہی ڈبو دو گے؟ کیونکہ تمہارے گھر کی ایک لڑکی کی وجہ سے مسائل ہوئے تو دوسری کو بھی اسکا حرجانہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے ہے ناں۔؟“

”بہن ہے وہ میری۔ غافل نہیں ہوں اس سے لیکن یہ صحیح وقت نہیں ہے۔ میں کچھ ماہ بعد اسکے لئے کوشش کروں گا لیکن اس وقت تم دیکھ رہے ہو میں ویسے ہی مسائل کا شکار ہوں۔“

بشر نرم پڑ گیا۔ جانتا تھا ضیغم یونہی بے پر کی نہیں اڑ رہا۔ اسے بھی کونج کی پرواہ تھی۔ ”اگر اس وقت میں نے اسکے لئے بات کی تو سارا خاندان میرے خلاف ہو جائے گا۔“

”تم نے ایک بار پہلے بھی اسی خاندان کے لئے کچھ کیا تھا جواب تک ایک تلوار کی طرح تمہارے سر پہ لٹک رہی ہے۔ اب ایک بار پھر وہی تاریخ دہرانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن میری ایک بات سن لو بشر۔“ وہ اٹھا اور اسکے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ ”اگر تم نے اسے سپورٹ نہیں کیا تو میں کروں گا۔ ابھی حق نہیں ہے میرے پاس لیکن نانا جان میرا نکاح اس سے کروانے میں زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ تم اپنی بہن کے لئے کچھ کر لو ورنہ میں اپنی بیوی کے لئے بہت کچھ کروں گا۔“

وہ بشر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ضیغم کا گلا پکڑ لیتا مگر خیر... ”زیادہ بکو اس کرنے لگے ہو تم۔ زبان سنبھال کر بات کیا کرو۔“ اسے جھڑک کر وہ دوبارہ پلنگ پہ آ کر بیٹھا۔ پریشانی اور تشویش نے ایک بار پھر گھیرا تنگ کیا اور اسکی انگلیوں نے میکا کی انداز میں ظفر کا نمبر

ملایا۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے ضیغم رکا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا اور ایک بار پھر بشر کو دیکھا۔ اتنے فری ہو لئے ہیں تو تھوڑا اور ہو جاتے ہیں۔

”پندرہ دن بعد ٹیسٹ ہے جو کرنا ہے جلدی کرو۔“

بشر نے جھک کر جو تاہاتھ میں لیا اور اسکی طرف اچھالا مگر وہ دروازے سے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ اس کے اس طرح بھاگنے پہ بشر ہلکا سا مسکرایا پھر اپنے موبائل کو کان سے لگایا۔ کچھ وقت بعد وہ کونج حاکم سے کہہ رہا تھا۔

”اپنی تیاری کر لو، بیگ وغیرہ پیک کر کے رکھو۔ میں کسی بھی وقت آؤں گا ہم کو نٹہ جارہے ہیں۔“

Safar-e-Adab

کسیر محل کے لان میں آج معمول سے ذرا ہٹ کر آنکھوں میں چمک پیدا کرنے والی روشنیاں تھیں۔ مستطیل میز پہ سفید کپڑا بچھا تھا۔ اسٹینڈ پہ کینڈلز سجی تھیں۔ جن سے موم قطرہ قطرہ پگھل کر وقت کے گزرنے کی شہادت پیش کر رہا تھا۔ سربراہی کر سی پہ قیس کسیر بیٹھا تھا۔ خاکی رنگ کے ہائی نیک سوئیٹر کے اوپر سفید جیکٹ اور خاکی پینٹ پہنے وہ آج الگ سے تیار تھا۔ گھڑی کے ڈائل میں آسمان کی نیلاہٹ کا منظر ابھر رہا تھا۔ گھر کے اندر سے اشتہا انگیز خوشبوئیں یہاں تک آرہی تھیں۔ انہی خوشبوؤں کے درمیان، اسے وہ خوشبو یاد آئی جسے بھولنے میں اسے صدیاں لگنے والی تھیں۔ کوئی خوشبو اس ایک خوشبو کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک عورت قیس کے لئے آدھی دنیا کی حیثیت رکھتی تھی۔

وہ قسیم کا مصروف سادن تھا۔ ڈیزائنرز چہرے پہ بے زاری اور مصروفیت لئے راہدار یوں میں ظہور پزیر ہوتے، اور پھر غائب ہونے لگتے۔ قیس کمبیر صبح کا اب دوپہر میں کسی میٹنگ سے لوٹا تھا اور اب اسکا ارادہ لُنج کا تھا لیکن حدیبیہ نے اسکی خوشی غارت کر دی کیونکہ اسکا لُنج بھی پلانڈ تھا۔ اپنا شیڈول سن کر سر ہلاتے ہوئے وہ آفس کی طرف بڑھ رہا تھا جب شیشے کے سٹوڈیو کے پار اس نے زینیا کو کچھ ملبوسات کی تصاویر اتارتے ہوئے دیکھا۔ قیس اسی طرف چلا آیا۔ حدیبیہ اسکے ساتھ تھی۔

”یہ کلکیشن کس نے باہر نکالی، تم سے کس نے کہا اسکی فوٹو گرافی کرنی ہے؟“ وہ گرجا۔ مگر ایک مانوس سی خوشبو پا کر ٹھہر گیا۔ میز پہ زینیا کا کھانا کھلا رکھا تھا۔ آلو کے قتلے، ساتھ تلی ہوئی بھنڈیاں اسکی بھوک چمکی۔

”مجھے یہ کام افشاں نے دیا تھا باس۔“ وہ اسی اعتماد سے بولی جو اسکا خاصہ تھا۔ وہ کیا کہنے آیا تھا بھول

گیا۔ ”حدیبیہ میڈم کو پتہ تھا۔“

”آپ کو کھانا کھانے کی تمیز نہیں ہے؟ کھانا کھول کر کون کام کرتا ہے؟“

”انکا کھانا تو ہر دوسرے روز کوئی ور کر کھا جاتا ہے۔“ ساتھ بیٹھی کسی لڑکی نے لقمہ دیا۔ ”اصل میں انکے

tradition میں اکیلے کھانا نہیں کھاتے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بیٹھے ہوؤں کو شامل ضرور کرتے ہیں۔ یہ

انکے میٹیکسٹس ہیں لیکن یہاں“ وہ بولتی رہی یہاں تک کہ زینیا کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”اگر آپ میں سے کوئی جو اُن کرنا چاہے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ روٹی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ یعنی اسکے علاقے کے لوگ واقعی اپنا کھانا شیئر کرتے تھے؟ قیس کے لب ہلکی سے مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

یہ کلکیشن واپس رکھو! اسکا شوٹ فلحال ”پنڈنگ“۔ اس نے نیا حکم صادر کیا۔

”باس آج لُچ یہیں کریں؟“ حدیبیہ شاید بھانپ گئی تھی اسکے باس کی نیت کھانے پہ خراب ہو چکی ہے۔ قیس نے گردن کا سریا یو نہی کڑائے رکھا۔

”مس حاکم کا دل رکھنے کے لئے میں تھوڑا ٹیسٹ کر سکتا ہوں۔ آفس لے آؤ۔“ لاٹ صاحب حکم نامہ جاری کرتے جیسے آئے تھے ویسے نکل گئے۔ زینیا نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شاید قیس کی بھوک وہ بھی بھانپ گئی تھی۔

”سارا کھانا دے دو گی تو تم خود کیا کھاؤ گی؟“ حدیبیہ نے سارا کھانا اسے اپنے حوالے کرتے دیکھ حیرت سے کہا۔ جو اب زینیا نے کچھ کہا تھا۔

”سارا کھانا تم لے آئی تو اس بیچاری نے کیا کھایا ہو گا؟“ وہ مزے سے گردن جھکائے نوالہ بناتے ہوئے پوچھا۔ کچھ خاص پرواہ نہیں تھی بیچاری کی مگر مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اس نے کہا کہ

”ہمارے یہاں ایک لوک داستان مشہور ہے سسسی اور پنوں کی داستان۔ کہتے ہیں جب پنوں کو سسی سے محبت ہو گئی تب سسسی کے والد نے شرط رکھی کہ ہمارا خاندان دھوبی ہے اور سسی سے شادی کرنے کے لئے تمہیں کپڑے دھونے آنے چاہیے۔ پھر کیا تھا پنہوں کو دھوبی گھاٹ جانا پڑا۔ سسی کے خاندان کے سارے مرد وہیں جمع تھے وہ بچتی بچاتی روٹی اور سالن کا ڈبہ لے کر اسکے پاس گئی۔ وہ اوٹ میں تھی کوئی اسے نہیں دیکھ سکا مگر وہ دیکھ سکتی تھی کہ سارے لوگ کس طرح پنہوں کے اول آئے جانے والے کھانے کو دیکھ رہے ہیں۔ اس نے پنہوں سے کہا۔ ”گردن جھکاؤ اور چپ چاپ سارا کھانا کھا جاؤ۔ کسی کو دعوت نہ دینا۔“

جواباً پنہوں نے کہا۔ ”بلوچ کی اولاد ہوں، کسی کو کھانے میں شامل نہ کروں تو یہ غیرت پہ حرف آئے گا۔“

سسی نے اسے ایک نوالہ اٹھاتے دیکھ کر کہا۔ ”پھر تیار ہو یہی ایک نوالہ ہاتھ آئے گا۔“

پنہوں نے سب کو مدعو کر لیا صبح کے بھوکے مرد آئے اور ایک ایک نوالہ لیا۔ سارا کھانا ختم اور پنہوں کے ہاتھ واقعی ایک نوالہ آیا۔ لیکن کم از کم وہ گردن جھکا کر اکیلے نہیں کھاتا رہا۔“

”اس بیچاری کے ہاتھ تو ایک نوالہ بھی نہیں آیا۔“ قیس نوالہ اچھے سے چبا کر پانی کا گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ ”خیر پنہوں کی اس فین کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور لٹچ کرواؤ۔“

”جی اسکا کھانا آپ کھائیں اور لٹچ میں کرواؤں۔“ وہ تپ گئی۔

”اب اچھا نہیں لگتا ناں ایک بینڈ سم، پرکشش، مرد ایک حسین لڑکی کو اپنے ساتھ لٹچ آفر کرے۔ مشرقی اقدار کا کچھ تو پاس رکھو حبیب۔“

ذائقہ دھواں دھواں ہو گیا۔ وقت کے کا سے پلٹ گئے۔ وہ نہیں تھی۔ اب وہ کہیں نہیں تھی۔ قیس کبیر اپنی غلطیوں میں جسے گنوا چکا تھا وہ اسکی عمر بھر کا اثاثہ تھا۔ جسے پانے کی وہ تدبیریں کر رہا تھا وہ اسکے دل کا مسئلہ تھی۔

کبیر محل کا شاہی دروازہ کھلا اور براق کی سفید لینڈ کروزر کروفر سے اپنے ٹائر جما جما کر رکھتی اندر داخل ہوئی۔ وہ گاڑی سے باہر آیا۔ گہری سانولی رنگت والے چہرے پہ آج ایک الگ سی چمک تھی۔ سیاہ سفید اسٹرپس والے سوئیٹر کے ساتھ سیاہ ہی بینٹ پہنے وہ سردی کے حساب سے اس ڈنر کی تیاری کر آیا تھا۔ سربراہی کرسی کے عین سامنے والی کرسی کھینچتے ہوئے اسکا چہرہ سپاٹ رہا۔

”کیا اب ہم سلام دعا سے بھی گئے؟“ وہ افسوس کر رہا تھا۔ کمبیر محل کے اندر سے آتی ہاتھوں کوٹ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے شیزل سیمسن اپنی جگہ تھم گئی۔ براق حنیف اسکے عین سامنے تھا۔ جالی دار دروازے سے اسے دیکھ سکتی تھی۔ ہاں وہ پہلے کی طرح اسکا دل نہیں دھڑکا تھا مگر وہ سامنے تھا تو دل کو کچھ ہوا۔

”کیوں بلایا ہے؟ مدعے کی بات پہ آؤ۔“

”کھانا کھاتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سیاہ سفید وردی والے ملازم کو اشارہ کیا۔ لمحوں کے اندر اندر میز سج گئی۔ خوشبوؤں نے اس میز کا احاطہ کر لیا۔ ملازمین مختلف ڈشز لالا کر رکھنے لگے۔

”مہدی کہاں ہے براق؟“ فرائیڈ رائس کا ایک چمچہ منہ میں رکھتے اس نے کہا۔ بظاہر براق کے چہرے پہ کچھ نہیں تھا مگر اندر کہیں وہ لرز گیا تھا۔

”قبرستان میں۔ کہو تو کھانے سے پہلے اسکی فاتحہ کر آتے ہیں۔“

”خیال برا نہیں ہے لیکن زندہ لوگوں پہ فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ براشگون ہوتا ہے۔“ وہ اب فرائیڈ فز اپنی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ ساتھ کھڑے ملازم نے اسکے پانی کا گلاس دوبارہ بھرا۔

”میری آخری اطلاعات کے مطابق تم پیتے نہیں تھے۔ اور اگر شروع کر بھی دی ہے تو یار وقت کا خیال رکھا کرو، ابھی شام تازہ ہے۔ اور تمہیں ابھی سے نشے چڑھنے لگے۔“ وہ ایک عربی ڈش چمچ سے چکھ رہا تھا۔ ساتھ ناک بھوں چڑھائی۔ ”تمہیں شیف بدلنے کی ضرورت ہے۔“

”اور تمہیں طریقہ واردات۔“

”میں یہاں تمہاری زو معنی باتوں کے جواب جاننے نہیں آیا۔“ انداز میں ناگواری تھی۔ براق کو ذائقہ پسند نہیں آیا تھا۔

”تم میری محبوبہ نہیں جس سے میں زو معنی گفتگو کروں گا۔“ کہہ کر پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ کھاتے وقت پانی کتنا پیتا تھا ناں وہ؟

”اپنی محبوبہ کو تم نے اس لائق چھوڑا کب ہے؟ اب کون سا مرد اس سے ایسی گفتگو کرے گا؟“

”وہی جسے اپنی جان عزیز نہیں ہوگی۔“ وہ ترکی باترکی اسکی باتوں کے جواب دیتا ہوا اسے زہر لگا۔ ”اسکی باتیں، لہجہ، اسکا وجود سب صرف میرے نام reserved ہے۔ لیکن وہ کہیں کھو گئی ہے اور مجھے کسی بھی طرح اسکو واپس لانا ہے۔“

”وہ تم پہ تھو کے گی۔“ براق ہنسا۔
 ”اونہوں یہ کام صرف شیزل سیمسن کر سکتی ہے وہ بھی براق کے لئے۔“ براق کا چہرہ سرخ ہوا۔ ”میری عورت لڑے گی جھگڑے گی، چیخے گی پھر مان جائے گی۔ اسکا ہر تعلق مجھ سے آکر نکلتا ہے۔۔“

”تو یہ سیشن تم جاری رکھو۔ لڑو، روٹھو، مناؤ میں اس سب کا حصہ نہیں ہوں۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ کھانے پہ بلا کر کسی کا کھانا زہر کرنا کیا ہوتا ہے کوئی قیس سے پوچھے۔ ”میں تمہارے اس جنون اور دیوانگی میں تمہارا حصہ دار نہیں۔“ قطعیت تھی اسکے انداز میں۔

”لیکن میرے بھائی کا قتل پلان کرنے میں اسے اغوا کروانے میں، اسکی آٹو پسی رپورٹ بدلوانے میں، میرے چچا کے فارم ہاؤس میں آگ لگانے، اور اسکے علاوہ کئی سیاہ کارناموں میں تمہارے ساتھ کون کون حصہ دار تھا یہ مجھے بہت اچھی طرح پتہ ہے۔“ شیزل سیمسن اپنی جگہ تھم گئی۔ تھما تو براق بھی تھا مگر

چہرے پہ تناؤ برقرار رہا۔ ”زمینا جہاں بھی ہے میں نہیں جانتا لیکن مہدی جانتا ہو گا اور اگر نہیں جانتا تب بھی وہ اسے ڈھونڈ کر لائے گا میرے لئے . . . اس لئے وہ جہاں بھی ہے اسے میرے سامنے واپس لاؤ۔ ورنہ میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ وہ مجھے نہیں ملی تو میں دنیا کا سارا سیاہ سفید ایک کر دوں گا۔“

”تم delusional آدمی ہو۔“ براق پھنکارا۔ ”یہ سب بکو اس جو تم نے کی ہے میں اسے تمہارا ذہنی عارضہ سمجھوں گا۔“ کرسی ایک طرف ہٹاتے ابھی اس نے دو قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے جب قیس نے اسے پکارا۔

”ٹھہر جاؤ براق حاتم نواب۔“ الفاظ تھے یازنجیریں۔ براق ٹھہر گیا ایسے جیسے برف جم گئی ہو۔ ایسے جیسے دو قدم آگے آگ کا دریا ہو۔ جالی کے پار شیزل سیمسن سانس نہیں لے سکی۔ ”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی، یہ قصہ ختم نہیں ہوا۔ شام تازہ ہے کزن ڈیرسٹ۔“

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سربراہی کرسی پہ بیٹھا مرد محظوظ نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ براق حنیف کو اپنا سارا وجود زمین بوس ہوتے محسوس ہوا۔ وہ زلزلے سے متاثرہ کسی عمارت کی مانند ڈھے گیا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”بس اسی چیز کی کسر رہ گئی تھی اب؟ ایک لڑکی نے کیا کیا گل نہیں کھلائے جواب تم دوسری کو اسی بے حیائی کے راستے پہ ڈال رہے ہو؟“ حویلی کے درو دیوار عالم نواب کی گرجدار آواز سے گونج اٹھے۔ بشر جو آج صبح ہی واپس آیا تھا انکے سامنے کھڑے نرم نظروں سے اپنے دادا کو دیکھا۔

”اس گاؤں کی ہر لڑکی پڑھ رہی ہے۔ کوئی ڈاکٹر بنے گی، کوئی انجینئر، اور کوئی وکیل۔ ہر پابندی میری بہنوں کے لئے کیوں؟“

”کیونکہ تم نواب خاندان سے ہو۔ ہماری بہو بیٹیاں اس طرح مردوں کے بچ نہیں اٹھتی بیٹھتیں۔“ جو ان جہاں پوتے کے سامنے انہیں آواز دھیمی کرنی پڑی۔ وہ بہت مشکل اور کئی کھیل کھیلنے کے بعد یہاں آیا تھا۔ اسے کھو نہیں سکتے تھے وہ۔ اسے کھونا بڑا خسارہ تھا۔

”نوابوں کی بیٹیاں بھی پڑھ رہی ہیں۔ جابز کر رہی ہیں۔ آپ کیوں دنیا پہ ہمارا غلط امپریشن دینا چاہتے ہیں؟ اور کوئٹہ اس نواب کی بیٹی ہے جسے دیس نکالا کا حکم دیا گیا تھا۔ اب وہ ایک مڈل کلاس گھر سے ہے۔“ اسکا لہجہ ویسا ہی باادب رہا۔ مگر اس میں استحکام بڑھ گیا تھا۔

وہ لڑتے، مارتے، اپنی ان بوسیدہ روایات کا ذکر لے کر بیٹھتے اگر سامنے کوئی عورت ہوتی یہاں مرد تھا۔ مرد بھی وہ جس پہ خاندان کی امیدیں ٹکی تھیں۔

”ہم نے ابھی بہت کرانس دیکھے ہیں بشر۔ میرے بچے تم پہ ہماری جان قربان لیکن تم خود سوچو۔ ہماری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ اور اگر اس کے بعد بھی ہم اسی طرح اپنی لڑکیوں کو آزادی دیتے رہیں گے تو دنیا ہمارے منہ پہ تھو کے گی۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”دادا تھو کنا غلط عمل ہے اس عمل کی روک تھام ہونی چاہیے جو میں کر رہا ہوں اسکی نہیں۔ بہن ہے وہ میری، میں اسے آزادی نہیں اسکا حق دے رہا ہوں۔ وہ دنیا سے اپنے حصے کا علم لے گی۔ اور ہماری عزت کو کچھ نہیں ہوا کم از کم میری عزت کو کچھ نہیں ہوا۔ جب عبداللہ سراٹھا کر جی سکتا ہے تو زینیا حاکم بھی جی سکتی ہے۔ یہ روایات نہیں تھیں جس نے میری بہن کا قتل کروایا۔ یہ روایات کے ٹھیکیدار تھے جنہوں نے نام نہاد عزت کے بیڑاٹھا رکھے تھے۔ اور اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہے میں کھڑے کھڑے یہ حویلی چھوڑ سکتا

ہوں۔ وہاں چلا جاؤں گا جہاں میری بہنوں کی پڑھائی سے حویلی کی عزت کو کچھ نہ ہوتا ہو۔“ اس نے حویلی کے اندر ہانک لگائی۔ ”کوئج بچہ دیر ہو گئی ہے کہاں ہو تم؟“

زینوں کے اختتام پہ وہ بیگ سینے سے لگائے خوف زدہ سی کھڑی تھی۔ بشر زینے پھلانگتا ایک جست میں اسکے قریب گیا بیگ لیا اور اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے لے آیا۔ کوئج دادا کے سامنے رکی جھک کر انکے قریب آنا چاہا مگر وہ ہٹ گئے تھے۔ ابا وہیں کھڑے رہے۔ بیٹی سینے سے لگی تو پیار نہیں کیا سر پہ ہاتھ نہیں رکھا۔ وہ بشر کے ساتھ چوکھٹ پار کر گئی۔ جب انکی زبان بے آواز بڑبڑائی۔

”فی امان اللہ“

فضاؤں کے کندھوں پہ سفر کرتے ہوئے، دریا اور سمندروں میں وقت کے چپو چلاتے ہوئے، جادوئی قالین پہ گھنٹوں اور دنوں کا سفر لمحوں میں طے کرتے ہوئے ڈھاکہ کی اس مڈل کلاس کالونی میں قدم رکھو تو راشدی ہاؤس کی چھت پہ شام کے سائے اتر رہے تھے۔ زینیا نے چھت کی چھوٹی سی دیوار کے پار دیکھا سائے لمبے ہو گئے تھے۔ وہ جلدی جلدی نیچے اتر آئی۔ کمرے میں آکر اپنا برقعہ اٹھا کر اوڑھا، نقاب درست کیا اور باہر نکل آئی۔

سڑکوں پہ معمول کا رش تھا۔ سبزی کے ٹھیلوں والے گھروں کو لوٹ رہے تھے صدائیں تھکی تھکی تھیں۔ مگر وہ انکی صداؤں پہ غور کرتی رہی۔ کوئی فون پہ کسی سے جھگڑتا جا رہا تھا۔ زینیا ان curse words کو نوٹ کرتی رہی۔ کوئی جوڑا جو کسی پارک اور کیفے اور گامزن تھا انکی زبانوں سے پھوٹتے محبت کے الفاظ اسکے ذہن کے خانے میں درج ہوتے رہے۔ وہ پوسٹر ز اور سڑک پہ لگے سائنز کی ساخت کو ذہن

نشین کرتی گئی۔ یہ کام وہ پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے کر رہی تھی۔ چند الفاظ اور سطور تو اب وہ باقاعدہ بولنے لگی تھی لیکن بولتے ہوئے وہ بالکل ایک غیر بنگالی لگتی تھی۔

نیا کے ہسپتال کے باہر اسے کوئی پانچ منٹ کھڑے رہنا پڑا، پھر وہ اسے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پہ تکان واضح تھی۔ زینیا پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے بلاناغہ اسے ہسپتال لینے اور چھوڑنے آتی تھی۔ راستے میں وہ کسی بچے سے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں چھوٹے چھوٹے لفظ کہتی۔ فیکٹریز، اور مارکیٹس کے چکر لگاتی۔ مگر اس سب میں وہ اپنے آس پاس، اپنے سائے تک سے ہراساں رہتی۔ جو اس سے چھینا گیا تھا وہ اس کا اعتماد تھا ملنا اب مشکل تھا۔ مگر ہار نہ ماننے والوں کے لئے اللہ راستے کھول دیتا ہے۔

”پھر کتنے لفظ سیکھے آج؟“ وہ ایک ٹھیلے پہ رک کر سبزی کا تھیلا بنواتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”یہ لوگ بہت جلدی بولتے ہیں میں آپ کی پندرہ منٹ کی کلاس سے زیادہ جلدی سیکھ سکتی ہوں۔“ تیما ہر روز اسے پندرہ منٹ یہی سکھاتی تھی۔ باقی کا وقت زینیا اس کے بھتیجے بھتیجیوں کو انگریزی پڑھانے میں صرف کر رہی تھی۔ اس کے زخم اب بہتری کی طرف تھے۔ زندگی میں سیلنس اور زینیا حاکم کے ”حل“ واپس آنے لگے تھے۔

”میں فری کی کلاسز نہیں دے رہی۔ اے یہ ٹماٹر نکالو۔“ پہلی بات زینیا سے دوسری اس سبزی والے سے کہی۔

”میں چند مذید ٹکوں کی قرض دار ہو جاؤں گی، بلکہ ہو چکی ہوں۔“ اس کے لہجے میں خنکی برقرار رہی۔ ساتھ اس نے آگے بڑھ کر خود سے تین چار ٹماٹر اور پیاز نکال کر صحیح والے ٹماٹر ڈالے۔ اسے خوف رہا کہ شاید وہ

سبزی والا اسکا ہاتھ جھٹکے گا مگر وہ چپ کھڑا رہا۔ اس نے ہاتھ واپس کھینچا تو اسکا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ جو اس سے چھینا گیا تھا وہ اسکے سوشل اسکلز تھے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس گھر جا رہے تھے۔ لوگوں کی نظریں ایک بار پھر اسے اپنے اوپر پڑتی محسوس ہوئیں۔ لوگ قہقہے مارتے دکھائی دیئے وہ بس ہر ایک سے نظر پھیرے چل رہی تھی۔ ایک آنریبل زندگی اسکی منتظر تھی۔ ایک دن تو یہ سارے خوف ختم ہو ہی جائیں گے۔

لان کے رنگ برنگی پھول، موم بتی کے شعلے، میز پر رکھے سجاوٹی پھول سب ساکن تھے۔ براق حنیف کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ وہ مڑ بھی نہیں سکا۔ وہ پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا جو کسی لمحے چیخ سکتا تھا۔ ”یاد ہے حدیبیہ کو قیسیم میں آنے کے لئے میں نے ایک ٹاسک دیا تھا۔ اسے کوئی راز لانا تھا وہ راز تمہارا شجرہ نسب تھا۔ میں بے وقوفوں کا سردار نہیں تھا جس کو تمہاری ان عنایات کا علم نہیں تھا۔ مجھے سب معلوم تھا کیونکہ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ جو کرنا تھا اکیلے کرنا تھا۔ اور میں تمہاری عنایات کے پیچھے کا موقف جانے بغیر نہیں ہٹ سکتا تھا۔ میں وہ سب لیتا رہا کیونکہ وہ میرا حق تھا جو تمہارے باپ نے چھینا تھا۔“

اب کے براق مڑا۔ اسکا چہرہ تاریک پڑ چکا تھا۔ اسکا دل اب تک شل تھا۔

”چھوٹی سی انڈسٹری ہے کون کس کا باپ ہے، کس نے کس سے خفیہ نکاح رکھے، اور کس نے بیٹے کو اپنا نام نہیں دیا کہاں چھپتا ہے؟“ کوئی تھپڑ تھا جو براق کے منہ پہ آ کر لگا تھا۔

وہ مڑا اور چھوٹے چھوٹے قدم لیتا ہوا آیا اور واپس اس کرسی پہ ڈھے جانے کے انداز میں بیٹھا۔ اسکی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ اسکے دماغ پہ ڈھیر سارا بوجھ پڑ گیا تھا۔ ”اور کون کون اس بارے میں جانتا ہے؟“

”آئی سویر کوئی نہیں۔ i am an excellent secret keeper“ وہ تفاخر سے کہہ رہا تھا۔ ”لیکن تمہارے بابا جانتے تھے مجھے سب علم ہے۔ میری ذہانت کے قصے تو تمہیں سنائے ہوں گے ناں؟“

براق شل رہ گیا۔ یہ کیسا دھوکہ تھا جو انکی موت کے ایک عرصے بعد اسے مل رہا تھا۔ وہ شخص اور کتنی بار اور کہاں کہاں لا کر براق کو کیسی کیسی موت مارے گا؟

”میرے بابا مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے تم جھوٹے ہو۔“ وہ کسی بچے کی طرح اپنے باپ کی صفائی دے رہا تھا۔

”وہ تم سے پیار نہیں کرتے تھے براق۔ انکو جسٹیفائی کرنا چھوڑ دو۔“

”تم جانتے تھے وہ میرے بابا ہیں تم نے پھر بھی انہیں قتل کیا۔ تم میری دوستی کا پاس رکھ سکتے تھے۔ تمہارا کیا بگڑ جاتا اگر تم انہیں میری خاطر زندہ چھوڑ دیتے۔ وہ میرے بابا تھے۔“ اسکے لہجے میں لرزش تھی۔ آنکھوں میں سرخی وہ قیس کا گریبان پکڑنا چاہتا تھا۔ چھری کانٹے سب اسکی گردن میں گھسا دینا چاہتا تھا۔ ”تم دیت لیتے کفارہ لیتے لیکن تم نے مجھ سے میرا باپ لے لیا۔ وہ میرا قیمتی سرمایہ تھا۔“ اس واقعے کو ڈیڑھ برس بیت چکا تھا مگر براق آج بھی بچوں کی طرح رویا۔ ”میری تو ماں بھی قتل ہو چکی تھیں تم نے میرا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا۔ تم نے یہ نہیں سوچا میں اپنے باپ کے بغیر کیسے زندگی گزاروں گا؟“

”خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ تمہارے باپ نے میری آنکھوں کے آگے میرے چچا اور میرے بابا کو مارا تھا۔ مجھ سے رحم کی امید رکھنا بے کار تھا۔ جب میں خالق حسین کو برباد کر سکتا ہوں تب میں حاتم نواب کو

کیوں چھوڑ دوں گا تمہیں سوچنا چاہیے تھا۔“ کھانے کی خوشبوئیں دم توڑ گئی تھیں اب فضا میں ٹوٹے دلوں کے کرب رچ بس گئے۔ سازشوں کی بوہر اور پھیل گئی۔

”میں نے تمہارے ہر انتقام میں تمہارا ساتھ دیا تاکہ تمہارا جنون ٹھنڈا ہو جائے اور تم میرے باپ کو بخش دو۔ میں نے تو انہیں بچانے کے لئے اتنا کچھ کیا تم نے پھر بھی انہیں مار دیا تم نے میرے بابا کو مارا۔“ وہ آنکھیں رگڑتا تو آنسو پھر بہنے لگتے۔ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا تو بری طرح زخم اکھڑنے لگتے۔ آج لمبے وقت بعد احتساب کا وقت آیا تھا۔

”ہم اس بحث کو ملتوی کر سکتے ہیں۔؟“ وہ کوفت سے بولا۔ ”تمہارے باپ کا قتل اتنا اہم نہیں ہے اور اگر ہے تو کسی دن مجھے اپنے گھر مدعو کر لینا خوب چرچہ کریں گے۔ اس وقت تم مجھے میرے سوالات کے جواب دو گے۔“

”میں تھوکتا ہوں تم پہ اور تمہارے سوالات پہ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چیخا۔ ”ہاں مہدی نہیں مرا میں نے اسے گولیاں لگوائیں تاکہ تمہیں ٹریپ کر سکوں۔ لیکن اپنے لئے گڑھا تم خود کھود چکے تھے ہاں وہ اب تک میرے پاس ہے مگر صرف چند گھنٹوں کے لئے چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ واقعی اس دنیا میں نہیں ہو گا اور میں بالکل اسی طرح اسے قتل کرنے کے معاملے میں آزاد ہوں جیسے تم“ وہ رکا۔ حلق میں کچھ اٹکا۔ ”جیسے تم میرے باپ کو قتل کرنے کے معاملے میں آزاد تھے۔ an eye for an eye“

قیس نے لمبی گہری سانس لی۔ بازو سینے پہ باندھے۔ ”تمہاری یہ جذباتیت ہمیشہ سے مجھے ناپسند رہی ہے۔ تم ابھی کے ابھی اپنے پالتو کتوں سے کہو گے کہ وہ میرے بھائی کو باحفاظت چھوڑیں کیونکہ اگر انہوں نے اس پہ انگلی بھی اٹھائی تو میں“ وہ وائٹ گلاس میں پڑے جو س کو ہلاتے ہوئے اٹھ کر اسکے قریب آنے

لگا۔ ”میں ساری دنیا کو بتاؤں گا تمہارا باپ کون تھا۔ کیا میں دنیا کو بتاؤں تمہارا باپ کون تھا براق حنیف؟“ وہ اسکے قریب کھڑا سرگوشی نما انداز میں کہہ رہا تھا۔ براق ساکت تھا۔ وہ آنکھوں میں بے یقینی لئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کیا قیس کمبیر کبھی اسے ہر خوف سے آزاد نہیں کر سکتا؟ آج اسے احساس ہوا وہ واقعی پیادہ تھا۔ اور قیس بادشاہ۔ کھیل، چال، مہرے سب براق کے اور بازی جیت کر قیس کے حصے میں آئی۔ براق کا کھیل بھی قیس کے حق میں۔ کیا اسکا باپ سچ کہتا تھا؟ کیا وہ واقعی وہی کرتار ہے گا جو قیس چاہے گا۔

”تم یہ نہیں کرو گے تم... تم نے میری ساری زندگی برباد کی ہے اب بس...“ وہ گیلے ہاتھی لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس ایک آخری چیز میرا ”آزر“ ہے تم مجھ سے وہ نہیں چھین سکتے۔ میں نے ساری زندگی تمہاری غلامی کی ہے اب بس۔“

”میں نے کہاناں براق مجھے فرق نہیں پڑتا۔ جو مجھے چاہیے وہ تم کرو گے ابھی کے ابھی۔ صرف ایک عورت میرے لئے وہی دنیا ہے اور اس تک جانے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ 1“ اس نے گلاس واپس میز پہ رکھا اور براق کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں انکار تھا۔ ”او کے جیسا تم چاہو۔“ بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے موبائل کان سے لگایا۔ ”ماہ جبین اگر مجھے انڈسٹری میں ایک گاسپ عام کروانی ہو تو کتنے وقت میں یہ خبر پھیل جائے گی؟“

”نہیں... پلیز نہیں...“ وہ بڑا بڑا رہا تھا۔ وہ شکوہ تھا۔

”او کے یعنی ایک گھنٹے کے اندر اندر؟ ٹھیک پھر میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں...“ وہ آگے کچھ کہتا مگر اسکا فون براق نے جھپٹ لیا تھا اور تیزی سے میز پہ دے مارا۔ قیس بے تاثر نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”میں تمہیں اسکے لئے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ ایک ایک لفظ توڑ توڑ کر ادا کرتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا۔ وہ زرقون کو کالزملا رہا تھا۔ رابطہ مل گیا۔ وہ چلا چلا کر اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا مگر کال کاٹی جا چکی تھی۔ براق حنیف کو موت لمحہ بالمحہ اپنے قریب آتی محسوس ہوئی۔ اسی لمحے جالی دار دروازہ کھلا۔

ششدر اور شاکی چہرے والی شیزل سیمسن باہر نکلی۔ براق کے منہ پہ کسی نے کھولتا ہوا تیل ڈال دیا تھا۔ اگلے کئی لمحات سلوموشن میں ہوئے۔ براق شیزل سے کچھ کہہ رہا تھا وہ اسے دیکھے بغیر باہر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اسکی آنکھیں سرخ اور گیلی تھیں۔ چہرہ عجیب۔ وہ بہت بری طرح شکاڈ تھی۔ براق نے شکوہ کناں نگاہوں سے قیس کو دیکھا۔ وہ اب بھی موبائل کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ براق بے بسی سے کال ملاتا رہا مگر نہ رابطہ ملتا تھا اور نہ ملا۔ وہ دھیرے دھیرے لان کی گھاس پہ بیٹھ گیا۔

تہی داماں، دست خالی، شکستہ حال۔

دروازے کے باہر گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتی شیزل وریام بیگ کا نمبر ملا رہی تھی۔ گھنٹیاں پلٹ پلٹ کر واپس آرہی تھیں، جواب ندارد۔ وہ تھک کر موبائل بند کرنے والی تھی جب اسے میسج موصول ہوا۔ ”ہزار بار کہا ہے اس نمبر پہ میسج اور کام مت کیا کرو۔ تمہارے ہاسٹل سے ذرا فاصلے پہ کھڑا ہوں وہاں آ جاؤ۔“

وہ میکاکی انداز میں اسی طرف جارہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ اسکی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ وریام کچھ سخت سست کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ پانی کی بوتل اسکی طرف بڑھا رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا آنکھوں میں نرمی تھی۔ شیزل نے اس سے پانی کی بوتل نہیں لی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔

”لے لو، اس میں زہر نہیں اور اگر ہوتا بھی تو تم پہ بے اثر تھا۔“

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے بوتل تھام کر لبوں سے لگائی اور سارا پانی غٹا غٹ پی گئی۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر خود کو پرسکون کیا۔ چند گہرے لمبے سانس لئے۔ اب کے اس نے وریام کو دیکھا تو اسکی آنکھوں میں قلق تھا۔ وریام البتہ کمپوزڈ اور قدرے بے نیاز لگتا تھا۔

”براق حنیف کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”براق حنیف نہیں، براق نواب کہو اسے۔“

ایک سرسراتے ہوئے جملے پہ وریام بیگ کئی لمحے کچھ کہہ نہیں سکا۔ گاڑی میں پن ڈراپ سائنس پھیل گیا۔

Safar-e-Adab

سفید کمرے میں موجود دو نفوس دو مختلف حالتوں میں تھیں۔ زر قون اب تک اسکی گردن کے گرد زنجیر کی سختی بڑھاتا جا رہا تھا۔ وہ کئی دن کی نقاہت کا مارا ذہنی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا شخص اسکی گرفت میں بن آج مچھلی کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مہدی کبیر اسکے بازوؤں کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا بس کسی بھی طرح اسے جھٹلنا چاہتا تھا لیکن یہ ایک ناممکن امر ہو گیا تھا۔

”مجھے اپنی جابز ادھوری چھوڑنا ہر گز نہیں پسند۔“ وہ دانتوں پہ دانت جما کر سختی سے بولا۔ ساتھ دباؤ بڑھایا۔ سبز آنکھیں باہر کو ابلنے لگی تھیں۔ اسکا دم گھٹ رہا تھا۔ گردن چھل رہی تھی۔ ”براق حنیف دماغ

سے پیدل ہے میں نہیں۔ کیا میں نہیں جانتا تم یہاں سے نکل کر ہمارے لئے کتنی مشکلات کھڑی کر سکتے ہو۔ تمہاری زندگی ہماری موت ہے؟“

مہدی نے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی سبز آنکھوں والی عورت اسکے ماتھے پہ محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ”تم نوبل ہو انس۔“

”آپ نے ان آنکھوں کی خوبصورتی دیکھی ہے؟ انکے اندر کی انسانیت دیکھی ہے؟“ سنہری آنکھوں والی لڑکی یادداشت کے خانوں میں دستک دگئی۔

”تم بڑے بڑے کام کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہو۔“ کسی دوست کا قیاس۔

”تم رہبر ہو، اللہ تمہارے ارادے سلامت رکھے۔“ کسی مددگار کی دعا۔

اسکی زندگی اسکی آنکھوں کے آگے کسی فلم کی طرح کٹنے لگی۔ اکیلا خالی، بے کار وجود کیا یہ وہی پبلک اسپیکر تھا جو بولتا تھا تو لوگ دم سادھ لیتے تھے، کیا یہ وہی سیاح تھا جس کے لئے وادیاں، صحرا، سمندر بانہیں کھول دیتے تھے؟ اس نے کئی پہاڑ سر کئے تھے، اس نے سمندروں کی گہرائیاں دیکھی تھیں۔ صحرا کی خاک چھانی تھی کیا سب ختم؟ وہ یونہی نہیں مرنے چاہتا تھا اسے اسکے ماں باپ یاد آئے۔ وہ اسے ڈھونڈتے، اگر اسکا کوئی سگابھائی ہوتا وہ اسکے لئے ضرور آتا۔

اسکے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ عین اسکے پہلو میں۔ جسم نے مزاحمت چھوڑ دی۔ اسکے پہلو میں گرے ہاتھ کی جلد سے کوئی شے ٹکرائی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے محسوس کیا وہ ایک آئینہ تھا۔ مہدی نے اسے چھوا، ہاتھ میں لیا۔ اس سے پہلے وہ سانسوں کی بازی ہارتا وہ شیشہ اس نے پوری قوت سے زرقون کے پیر کے اندر گھسا دیا۔ وار اچانک تھا زرقون بلا ارادہ پیچھے ہوا، گرفت چھوٹ گئی۔ سبز آنکھوں والے نے زندگی

چاہے۔ وہ واقعی بے ہوش تھا۔ سبز آنکھوں والا مرد اب جھک کر اسکے کافتان کی جیب سے اسکی بندوق، لائٹر، اور رقم نکال چکا تھا۔ اسکی دوسری جیب میں ایک کارڈ تھا مہدی نے اسے بھی ہتھیلی میں دبوچا۔ وہ چندپل اسکے سر پہ کھڑا رہا یوں جیسے اسکی ہر، ہر جنبش پہ نظر رکھنا چاہتا ہو۔

مہدی نے پستول اپنی آنکھوں کے آگے کی۔ پھر فرش پہ پڑے زرقون کو دیکھا جسکی آنکھوں سے خون رس رہا تھا۔ اسکے پیر سے بھی خون بہہ کر فرش کو سرخ کر تا جا رہا تھا۔ مہدی پسینے سے شرابور اسکے سر پہ کھڑا گہرے سانس لیتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اگر وہ ہوش میں آ جاتا تو اسے مار دیتا۔ لیکن اگر وہ خود ہی مر جاتا تو؟ اس نے پستول اسکے دل کے مقام پہ سیدھی کر لی۔ ہر وہ دن، منٹ، گھنٹہ، رات یاد کی جب اس آدمی نے اسے تکلیف دی تھی۔ گلے میں گٹی ابھری اس نے بے اختیار ڈھیر سارا تھوک نگلا۔

”مجھے یہاں سے نکالو زرقون... پلیز۔“ لرزتے ہاتھوں پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

تمہارا باس کون ہے؟ میری بات کرواؤ، مجھ سے بات کرو پلیز۔“ اس نے ڈھیر سارا تھوک نگلا۔ فوکس فوکس، فوکس۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”مجھے درد ہو رہا ہے، پلیز مجھے میری ٹیبلٹس دے دو... پلیز مجھ سے بات کرو... میری بیوی کہاں ہے؟... یہاں سے نکالو... مجھے درد... مجھے مار دو...“ ہر آواز، ہر منظر اس نے ہر درد کو جھٹکا۔ اسکے پاس انتقام کا وقت تھا زریعہ تھا۔ وہ یہاں سے نکل سکتا تھا۔ وہ اسے مار سکتا تھا اور وہ مارے گا۔ اب دنیا کو چاہیے وہ مہدی کبیر سے saint رہنے کی امید چھوڑ دیں۔ اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور اگلے ہی لمحے سفید کمرے میں تین فائرز کی آوازیں گونجیں۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

زرقون کے جسم سے فوارے کی مانند رواں خون نے سفید کو سرخ کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ وہ غیر انسانی چہرہ لئے اسے دیکھ رہا تھا جسے درد نے جگا دیا تھا۔ تڑپ اور تکلیف پھر حاوی ہوتی چلی گئی۔ اسکی دونوں ٹانگوں کے اوپری حصوں میں سوراخ تھے۔ اور اسکا ایک ہاتھ جس سے اس نے مہدی کو تھپڑ مارا تھا اسکے عین پیچوں پیچ گولی کھب چکی تھی قاتل نہیں تھا وہ لیکن اس قید خانے سے نکلنے کے بعد سادھ بھی نہیں رہنے والا تھا۔ یہاں سے نکل کر جو زندگی اسکی منتظر تھی اس میں مہدی کبیر سب تھا، معصوم، بے ریا نہیں تھا۔

زنجیر کو اپنی کلائی پہ لپیٹتے ننگے قدم آگے بڑھتے اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ مہدی کبیر کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اس نے پہلا قدم کمرے سے باہر رکھا اور اسے رنگ نظر آئے۔ جابجا رنگ۔ ہر اور رنگ۔ اس نے جائزہ لیا، وہ ایک اسٹوریج روم تھا جہاں رولز میں لپٹے ہر رنگ کے کپڑے تھے۔ دیوار گیر ریک سے جھانکتے نیلے، سرخ، سبز، سیاہ سلک، ساٹن، اور مخمل کے کپڑے مہدی کبیر کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ اس نے خود کو گھسیٹا۔ اور ایک ریک کے قریب آکر کھڑا ہوا۔ جھک کر اس کپڑے کو چھوا۔ رول پہ بی قیو (بیز کلبکیشن، قیسم۔ براق حنیف اور قیس کبیر کی ٹیکسٹائل فیکٹریز) کا ٹیگ درج تھا۔ وہ اپنے گھر میں قید تھا؟ اسکی روح تک میں سنسناہٹ اتری۔ کوئی کسی کو اسکے گھر میں کیسے قید کر سکتا ہے؟

اس نے خود کو کمپوز کیا اور باہر نکل آیا۔ یہاں آکر اسکے چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔ وہ اس وقت چوتھی منزل پہ تھا۔ اور چاروں منزلوں پہ چاروں طرف دیوار گیر ریک تھے اور ان میں کپڑے کے رول رکھے ہوئے تھے۔ دھاگے اور روئی کے بڑے بڑے گولے بھی۔ اسے اب احساس ہوا تھا وہ ایک ویڑھاؤس میں قید تھا جہاں ایک فرضی وائٹ روم بنایا گیا تھا۔ اسکا دماغ اب تک شل تھا۔

متوازن قدم لیتا اپنے وجود کو با مشکل گھیٹتے ہوئے اس نے لفٹ کے قریب رک کر زر قون کا کارڈ سوائپ کیا۔ لوہے کے پٹ آپس میں جدا ہوئے دروازہ کھل گیا۔ وہ جس عمارت میں غلاموں کی طرح رہا تھا اسکا مالک تھا جن راستوں پہ غیروں کی رہنمائی سے چل رہا تھا یہ اسکی ملکیت تھی۔ وقت آنکھیں پھیر لے تو اچھے خاصے سو رماڑھے کرگرتے ہیں۔ وقت کی یہی ضرب اسکے منہ پہ بھی لگی تھی جسے وہ تا عمر یاد رکھنے والا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر کسی کو نہیں بھولے گا یہ طے تھا۔

لفٹ میں سوار ہونے سے نیچے آنے تک اسے کوئی زی روح نظر نہ آیا۔ ویڑھاؤس واقعی چند گھنٹوں کے لئے پورا کا پورا خالی ہو چکا تھا۔ مگر یہ محض اسکی خام خیالی تھی۔ یا اسکا ذہنی عارضہ۔ وہ باہر نکل کر بھی hallucinations سے جان نہیں چھڑوا سکا تھا لفٹ لوگوں سے بھری ہوئی تھی جو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے کچھ نگاہوں میں خوف تھا اور کسی نے اس سے گن پکڑنی چاہی جب اسے ہوش آیا۔ کسی نے اسکے کندھے پہ دھک مارا اور اسے سب نظر آیا۔ اسے لوگ نظر آئے، اسے بہت سارے لوگ نظر آئے۔ مہدی نے فوراً بندوق ان پہ تانی دونوں مردوں نے ہاتھ اوپر کر لئے۔ مہدی نے ان میں سے ایک کا مفکر کھینچ کر اتارا۔ لفٹ روکی اور باہر نکل آیا۔ یہاں آکر اسے اپنی اصل غلطی کا احساس ہوا تھا۔

”یہ کون ہے؟“

”اوہ خدایا، اسکے پاس گن ہے۔“

”یا اللہ یہ تو مہدی ہے ناں؟“

مختلف لوگ، آوازیں، شور مگر اسے کیوں سب سفید دکھائی دے رہا تھا؟ کورا سفید؟ ایک لمحے کو سب دکھائی دیتا اگلے لمحے سب خالی، سب ختم۔ کیا وہ پاگل ہو رہا تھا؟ یا وہ پاگل ہو چکا تھا۔

”کال اٹھاؤ... جاہل انسان کال اٹھاؤ۔“ وہ گھٹنوں کے بل گھاس پہ بیٹھے ہوئے زر قون کو کال ملا رہا تھا۔ جب اسے اپنے نمبر پہ زر قون کے کسی ٹیم ممبر سے ایک فونیج ریسو ہوئے۔ زر قون کی رانوں میں گولیوں سے چھید تھے اسکی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ براق کی ساری پلاننگ ضائع ہو گئی۔ وہ کئی لمحے بس ان تصاویر کو دیکھے گیا۔

اس نے سر جھٹکا منظر واضح ہوا۔ لوگ اسے تک رہے تھے۔ مہدی نے مفکر چڑھالیا اور اندھا دھند بھاگا۔ گارڈز، سیکورٹی کا عملہ جو اسکے سامنے آتے وہ بغیر کسی کی طرف دیکھے زنجیرانکے چہرے، گردن، پشت پہ برساتے آگے بڑھتا جاتا۔ رکنا موت تھا اسے مرنا نہیں تھا۔ اگر وہ آج سے پہلے اس ویڑھاؤس نہ آیا ہوتا تو مسائل ہو سکتے تھے لیکن وہ آچکا تھا۔ سیاح کو اسکے شوق نے بچا لیا تھا۔ اسے اسکی observations نے بچا لیا تھا۔

براق کے ہاتھ کپکپانے لگے، اسکے سامنے کرسی پہ بیٹھا گھونٹ گھونٹ کوئی مشروب حلق میں اتارتا قیس کسیر اسے بے تاثر نگاہوں سے تکتا رہا۔ ”اس نے زر قون کو مار دیا ہے۔“ آدھے عرب کی آواز کسی کھائی سے آتی تھی۔

قیس مسکرایا۔ ”آہ میرا بھائی۔ بلاخر اس نے دکھا دیا وہ ایک اصلی کمبیر ہے۔“ فخر، مان، کروفر، کیا نہیں تھا اسکے لمبے میں۔ وہ پہلا بڑا بھائی تھا جو چھوٹے بھائی کا پہلا قتل سیلیبریٹ کر رہا تھا۔

اس نے دوسری منزل میں قدم رکھا جب ایمر جنسی الارم بجنے لگا۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ملازمین جو کہ نیا آنے والا اسٹاک ان لوڈ کر رہے تھے افراتفری میں یہاں سے وہاں بھاگنے لگے۔ سیکورٹی افسران کی ایک بہت بڑی تعداد عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ شہزادہ اپنے محل میں باغیوں کے درمیان جکڑا جا چکا تھا۔ جلتی بجھتی سرخ بتیوں میں لوگوں کے شور اور سیکورٹی افسران کی آمد کے بیچ مہدی کمبیر ایک ریک کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اسکا سارا وجود خوف سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ بھاری بوٹوں کی دھپ دھپ کی آواز اسی طرف آرہی تھی اس سے پہلے مہدی کچھ کر پاتا اسکی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اور وہ ساکت رہ گیا۔ سی سی ٹی وی کیمرہ اوہ خدا یا۔

”ٹیم بی فلور نمبر ٹو۔“ مائیک چہرے کے قریب کئے لیڈر چیخ کر اپنی سیکورٹی ٹیم کو جگہیں سنبھالنے کا کہہ رہا تھا۔ یہاں کروڑوں اربوں روپے کے کپڑا اسٹور ہوتا تھا کیا یہاں کی سیکورٹی ٹیم سے ایک آدمی بھاگ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ وہ گرفتاری دے دیتا اگر اسے یقین ہو تا ورنہ اس پہنے ان لوگوں کے دلوں میں انسانیت ہے۔ انسانیت کے رہنما کے دل سے انسانیت پہ اعتبار اٹھ گیا تھا کوئی اسکا اور کیا نقصان کر سکتا تھا؟

اس نے فلور سے جھک کر دیکھا۔ لوگ اوپر آہے تھے انکے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ وہ لوگ تھے بس لوگ۔ مہدی نے انہیں دیکھا۔ ایک سانس، دو سانس، تین سانس مہدی کو لوگ ڈراتے نہیں فیسینیٹ کرتے ہیں۔ اس نے دہرایا اور جیب سے زر قون کالا سٹر برآمد کیا۔ اور شعلہ جلا یا۔ اس سے پہلے کوئی اسکے قریب پہنچ پاتا مہدی نے آگ کا وہ شعلہ سلک کے کپڑے سے ٹکرایا۔ پھر ساٹن، پھر ریشم۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک ایک رول اٹھا اٹھا کر فلور پہ پٹخ رہا تھا۔ آگ بلاخر بھڑک

اٹھی تھی۔ مہدی کمبیر اس فلور سے بھاگ رہا تھا۔ سمت کا کوئی تعین نہیں تھا۔ ویڑھاؤس کے دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ مستعد عملہ سامان ٹھکانے لگا رہا تھا اور وہ اسیر بس اپنی جان بچانے کو بھاگ رہا تھا۔ آس پاس ارد گرد کئی لوگ تھے جو اسکے ہاتھ میں بندوق دیکھ خود بخود راستہ دینے لگتے تھے۔ وہ لوگ پلک جھپکتے نظر آتے اور پلک جھپکتے غائب۔

ہر ریک کر قریب ریک کر وہ آگ کا شعلہ بھڑکاتا جاتا اسے یقین تھا جب وہ پہلے فلور پہ ہو گا دوسرا فلور جل رہا ہو گا۔ وہ جو جلا تھا اس نے سب کو خاکستر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایک شعلہ اس کا دل جلا رہا تھا۔ کپڑے سے محبت اسکے خون میں بستی تھی۔ کوئی اس سے پوچھے وہ کیسے اپنے عشق کو نظر آتش کر رہا تھا۔

”سر زرقون صاحب کہیں نظر نہیں آرہے، اور ایک آدمی جو کہیں سے گھس آیا ہے وہ ویڑھاؤس میں آگ لگا چکا ہے ہر طرف آگ لگ گئی ہے۔ وہ آدمی مہدی کمبیر جیسا دکھتا ہے۔ یا پھر مہدی لیکن وہ مر چکے ہیں ہم کیا کریں؟“ سیکورٹی روم میں کھڑا ایک افسر بے حد اضطراب کے عالم میں رپورٹ کر رہا تھا۔ براق حنیف کا دل آگ پہ رک گیا تھا۔

”آگ کہاں لگی ہے؟“

”تھرڈ فلور سر، آگ بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے ہم ورکرز کو باہر نکال رہے ہیں۔“

”وہ جو بھی ہے، اسے باحفاظت جانے دو۔“ اس نے خود کو کہتے سنا۔ ”اسے ایک خراش بھی آئی تو میں تمہیں اور تمہاری ٹیم کو اسی برف کے اندر دفناؤں گا۔“ براق نے موبائل کان سے اتارا۔ اسکی آنکھیں خالی تھیں وہ جانتا تھا بیٹھے بیٹھے اسے کتنا نقصان ہوا ہے بس وہی جانتا تھا۔

”میرا بھائی ٹھیک ہے؟“ موم بتیوں کے شعلوں کی ٹمٹماہٹ میں اس کا چہرہ دھندلا ہو رہا تھا۔

”بھائی ہے.....“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”کاروبار گیا۔“

قیس بہ دقت مسکرایا۔ ”کاروبار اور بہت۔“

آگ لگنے پہ ویڑھاؤس کے سیلنگز پانی برسانے لگے تھے۔ سرخ بتیاں، آگ اور برستے ہوئے پانی میں وہ کبھی چہرے سے پانی صاف کرتا، کبھی اپنے بچانے کو لوگوں کی طرف دیکھتا مگر غیر یقینی طور پہ اب کوئی اسے نہیں پکڑ رہا تھا۔ ہر کوئی کپڑا بچانے اور آگ بجھانے میں لگ گیا تھا۔ چند لمحہ قبل اس لشکر کی کان کے آلوں میں ایک پیغام گونجا تھا اور اسکے بعد انہوں نے مہدی کمبیر کو پکڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے بھی کھیل کا حصہ سمجھ کر بغیر کسی کی طرف بھاگے جا رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور پہ آکر اسے چار دروازے دکھے جن کے پار دنیا تھی۔ دروازے ایسے تھے جیسے کسی دکان کے شٹر ہوتے ہوں مگر زیادہ قیمتی، محفوظ اور بھاری۔ جلتی بجھتی سرخ بتیوں سے بے نیاز، گرتے پانی سے ٹھٹھرتے زخموں سے چور اس نے قید خانے کا دروازہ پار کر لیا تھا۔ وہ قید خانے سے نکل آیا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

باہر برف باری تھی۔ وہ بغیر بازوؤں والی گیلی شرٹ میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ سیکورٹی ٹیم میں سے کوئی تین سے چار لوگ اس کی طرف بڑھے اپنے تئیں وہ اسے کسی محفوظ مقام پہ لے جانا چاہتے تھے کہ یہ براق کا حکم تھا مگر وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے بے اختیار ان تینوں پہ گولی چلائی۔ کسی کی ٹانگ کسی کا بازو زخمی ہوئی اور وہ بھاگ رہا تھا۔ گرتے پڑتے، مرتے بچتے وہ بس بھاگ رہا تھا۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ مگر وہ سیاح تھا کہاں کیا ملے گا اس کا اسے علم تھا۔ ان لوگوں میں سے جو جو اسکے پیچھے آیا تھا مہدی نے اس پہ فائر کھولا

یہاں تک کہ بدوق خالی ہو گئی تھی۔ اسکی حالت ایسی تھی کہ اسے ہر شے ہر منظر سلو موشن میں ہوتا دکھائی دیا۔ اسے کچھ بھی ٹھیک سے سنائی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سردی سے اسکے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ پٹھے اکڑ گئے تھے جب اسے کوئی راگیر دکھائی دیا۔ وہ اس سے موبائل لینے کے لئے منت کر رہا تھا ذرا تردد کے بعد اسے موبائل مل چکا تھا۔ اس نے کسی کو کال ملائی کوئی سنگت۔ دوسری طرف بے یقینی بس بے یقینی۔ پھر کیا ہوا اسے یاد نہیں رہا۔ پھر وہ گرا تھا، پھر اس نے محسوس کیا جیسے وہ مر رہا ہو۔ پھر اس نے کسی کو اپنے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے دیکھا۔ وہ متفکر آنکھیں، وہ گرتی برف۔ پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک لمبی نیند کے لئے۔

وہ جتنا لڑ سکتا تھا لڑ لیا اب جو کرے بخت کرے۔

Safar-e-Adab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”سات ماہ بعد۔“

کوئیٹہ میڈیکل کیمپس کے اندر سبزہ زار پہ بھاگتی ہوئی لڑکی کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جسے وہ ہوا میں لہرا رہی تھی۔ یہ وہ کوچنگ حاکم نہیں تھی جسے تم جانتے تھے، یہ وہ تھی جس نے خود کو جاننا شروع کیا تھا۔ وہ کسی مرد کے سامنے آکر رکی۔ فرط جذبات سے اسکا چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں آنسو۔ وہ بے تحاشا خوش نظر آرہی تھی۔

”ہو گیا ادا میرا داخلہ ہو گیا۔ . . میرٹ پہ ہو گیا . میرا داخلہ ہو گیا۔“ بشر نے فخر سے اسے گلے سے لگایا تھا۔ اسکی آنکھوں کے آگے وہ پرچہ بھی لہرا رہا تھا جس میں زینیا حاکم نواب نے سی ایس ایس کے امتحان کو پاس کر لیا تھا۔ دل میں ہوک اٹھی۔

جانے وہ کہاں تھی، جانے اسکا کون اسکے حصے کی کامیابیاں سمیٹے گا۔ سر جھٹک کر وہ اسکی کامیابی پہ خوش ہوا جو قریب تھی۔ اور اسکے لئے دعا گو جو دور تھی۔

ستمبر ڈھاکہ میں بھی مہمان بن کر اتر ا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا آسمان پہ سیاہ چھوٹے چھوٹے بادل تھے۔ شاید آج مینہ برسے گا۔ اس نے دل ہی دل میں قیاس لگایا اور واپس پردے برابر کر دیئے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا سراپا دیکھا۔ سفید کڑھائی والے جوڑے کے ساتھ سفید ہی ٹراؤزر پہنے اس نے کندھوں سے ذرا سا اوپر بیوٹی بون کو چھوتے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ انکی رنگت آج بھی ویسی تھی اور گھنے بھی آج بھی ویسے کے ویسے۔ مگر لمبائی کم ہو گئی تھی بے حد کم۔ لمبے بال اسے بہت کچھ یاد دلاتے تھے سو اس نے کاٹ دیئے، یادیں مٹا دیں۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE
یہ بال اس نے تب کاٹے تھے جب اس نے یہاں اس شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کئی ایک لوگ جنہوں نے شاید اسے کبھی سوشل میڈیا پہ دیکھا بھی تھا تو اسکے اس روپ میں کوئی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ کنگھا اٹھا کر اس نے بالوں میں پھیرا۔ جلے ہوئے بازو پہ داغ اب بھی تھے مگر گولی کے زخم کی وجہ سے وہ آج بھی اسے پوری طرح اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ مسائل بہت تھے مگر۔ خیر۔

چہرے کے زخم اب معدوم تھے۔ جسم پہ شاید نشان اب بھی کہیں ہوں گے۔ دفعتاً اسکی نگاہ اس سلور پینڈنٹ پہ پڑی۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں اسکے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ وہ آئینہ دیکھتے زخمی سا مسکرائی۔

”تم نے مجھ سے غلط بیانی کی تم نے کہا تھا تم مجھ سے کبھی موو آن نہیں کر سکتے۔“ گلے میں کچھ اٹکا اس نے لمحے بھر کا وقفہ لیا۔ ”تم نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں بھی تم سے موو آن نہیں کر پاؤں گی۔ بڑا غلط کیا ہے تم نے میرے ساتھ۔ ایسی محبت کہاں کرنی تھی مجھے؟“ یاسیت سے کہتے اس نے ہر بار کی طرح پینڈنٹ لبوں سے لگایا۔ اسکی خوشبو، لہجہ، سارے کا سارا مہدی اپنے قریب محسوس ہوا۔

پیروں میں عام سی چپل ڈالتے ہوئے اس نے سرخ بڑی سی چادر اٹھا کر اوڑھی پھر اسے چہرے پہ ماتھے تک آگے لے آئی۔ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ زندگی کی طرف واپسی کی مسکراہٹ۔

گھر سے نکل کر سوسائٹی کا جنگلہ پار کرتے ہوئے اس نے سویتا تائی کو ہیلو کہا۔ نوید کے چھوٹے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سڑک پہ چلتے ہوئے فیکٹری کی طرف جاتے ہوئے اب اسے بنگالی سمجھ آنے لگی تھی۔

دل کے درد دل میں چھپائے غلطیوں سے سیکھ اٹھائے اب وہ جینا سیکھ رہی تھی۔ زندگی کسی کے لئے نہیں رکتی اسکے لئے کہاں رکتی؟۔

کبیر محل میں شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اس محل میں اب سوئی گرنے کی بھی آواز آتی تھی۔ قیس کبیر اب یہاں کم آیا کرتا تھا۔ کام نے اسے مصروف کر دیا تھا مگر رات کے یہ تین پہر وہ ان تین پہروں میں بالکنی میں بیٹھ ہزار دفع پڑھی گئی اسکی چیٹ پڑھا کرتا تھا۔ کسی پروجیکٹ، کسی شوٹ کے دوران

نکالی ہوئی تصاویر میں اسکی تصاویر دیکھتا تھا۔ اسکی نگاہیں آج کل دروازے پہ ٹکی رہتی تھیں۔ صحت گر رہی تھی۔ زندگی ویران ہو گئی تھی۔ وہ جو گئی تھی اسکی رونقیں لے گئی تھی۔

آج ایک بار پھر وہ اسی بالکنی میں تنہا بیٹھا تھا۔ بالکل تنہا لیپ ٹاپ سے کسی پرانے گانے کی پرسوز آواز ابھر رہی تھی۔

”تو نے دیوانہ بنایا تو میں دیوانہ بنا

اب مجھے ہوش کی دنیا میں تماشا نہ بنا“

سگارا انگلیوں کے درمیان رہنے لگا تھا۔ آج کل بے دھیانی ایسی تھی کہ انگلیاں جل جاتی تھیں دل کی طرح۔ اب اسکی چائے ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ بھورا کاغذ اور قلم لے کر وہ آج بھی اسکے نام کچھ لکھتا تھا۔ جس کی ابتدا یوں ہوتی تھی۔

”تمہارے نام یعنی محبت کے نام۔“ درمیان میں وہ بہت کچھ لکھتا۔ معافی نامے، محبت نامے، اپنی بے قراری کے قصے مگر بھیجنے کے لئے کوئی پتہ نہیں تھا۔ کیا یہ اذیت نہیں تھی؟

۔ ٹھنڈی سانس ہوا کے سپرد کرتے۔ آسمان پہ نگاہیں ٹکاتے وہ ایک بار پھر اس کے لاشعور سے مخاطب تھا۔

”اسلام آباد تمہارے بغیر بورنگ ہو گیا ہے۔“ وہ انتقام کی فصل سے پچھتاوے کاٹ رہا تھا۔

اسکرود کے ایک لکڑی کے مکان کے باہر لکڑی کے ہی زینوں پہ کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے جسم پہ سفید شلوار قمیض تھی۔ جس کے اوپر سیاہ سویٹر پہن رکھا تھا۔ کندھوں پہ پڑی سفید شال ڈھلک کر زینوں پہ گر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کی بوندیں اسکے پیروں کو چھو رہی تھی۔ مگر آج وہ اس بارش کو نہیں دیکھ رہا

تھا۔ زندگی بارش، چائے، قہقہوں سے بہت دور آگئی تھی۔ زندگی یکدم تنہا ہو گئی تھی۔ دفعتاً اس کے عقب میں لکڑی کا دروازہ کھلا اور اسی کا ہم عمر کوئی تنومند مرد ہاتھ میں بڑے بڑے دواسٹیل کے کپ لے کر باہر آیا۔ اسکی ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ اور کپ بھاپ اڑا رہے تھے۔

”اوہ . . . تم یہاں بیٹھے ہو مہدی۔ میں ہمیشہ کی طرح تمہیں اندر ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ اس سے ایک درجہ اوپری زینے پہ آکر بیٹھا۔ مہدی جواب دیئے بغیر سامنے دیکھتا رہا۔ چائے کے بھاپ اڑاتے کپ اسے کسی کی یاد دلاتے تھے۔ صبح کی پہلی پو پھوٹے ہی اسے کسی کی بالکنی یاد آتی تھی۔ کسی کی باتیں سنتا تھا تو محض اسکی کڑوی کسبلی باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ وہ آج کل بڑا مضطرب تھا یہاں وہ سانس لیتا تھا یہاں ”وہ“ یاد آ جاتی تھی۔

”میرا چھوٹا سا گھر ہے میں سمجھ سکتا ہوں تم جیسے سیاح کا یہاں دم گھٹتا ہو گا۔“ اس نے کپ ذرا سا آگے کھسکایا۔ مہدی نے اب بھی جواب نہیں دیا۔ بس سامنے دیکھتا رہا۔

”ڈاکٹر نے کل رات کیا کہا تھا؟“ کافی دیر بعد چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 BEING THE STRING OF YOUR KITE
 ”تمہارے زخم اب تو بالکل ٹھیک ہیں ورنہ میں ڈر گیا تھا کہ جو انفیکشن تمہیں ہوا تھا وہ کہیں معاملہ خراب نہ کر دے۔ سچ کہوں مہدی مجھے تو اس روز تمہاری کال نے ڈرا دیا تھا۔ لیکن میں پھر بھی وہاں آیا میں دیکھنا چاہتا تھا اگر یہ پریک کال بھی ہے تو کس نے کی ہے؟“ اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ ”وقت بہت جلدی گزرتا ہے میں نے سنا تھا لیکن کوئی مجھ سے پوچھے تمہاری بیماری نے وقت کو کیسے روک دیا تھا۔ میں نے تمہاری ازیت تمہارے ساتھ دیکھی اور بڑی مشکل سے دیکھی ہے۔“

اب کے مہدی نے اسکے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اسکا مشکور تھا۔ لبوں سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔

”تم ٹھیک ہو گئے ہو اب کہیں گھومنے چلیں۔ پرانی یادیں ہی تازہ کر لیں گے۔؟“

مہدی کمبیر نے چائے کا کپ واپس زینے پہ رکھا۔ ”میں کل صبح اسلام آباد جا رہا ہوں۔ اسکے بعد بلوچستان۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے؟ اسلام آباد میں اب رکھا کیا ہے؟ دنیا کی نظروں میں تم مر گئے ہو تم اب وہاں۔“

”it’s all about her“ اس نے اپنے میزبان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔ ”میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا تھا جب وہ اکیلی ہوگی تب میں اسکے ساتھ رہوں گا۔ مجھے وعدہ نبھانے جانا ہے۔“

اسکے سامنے بیٹھے آدمی کا دماغ بھک سے اڑا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے؟ وہ آٹھ ماہ سے کہاں ہے کوئی نہیں جانتا۔ پتہ نہیں دنیا کے کس کونے میں ہے تم اسکے لئے خود کو غیر محفوظ کرو گے؟“

”یہ صرف ایک دنیا ہے۔ ایک چھوٹی سی دنیا۔ میں اسکی تلاش میں ستارے، سیارے، اور کئی کہکشائیں پھر سکتا ہوں۔ بیوی ہے وہ میری۔“

کہہ کر وہ اٹھا۔ چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔ اندر کی طرف جاتے ہوئے وہ ایسی ملاقات کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا جو اسکے اعصاب پہ بھاری پڑنے والی تھی۔ کئی ماہ کی ازیت کے بعد اب احتساب کا وقت تھا۔

اسلام آباد کی ایک نجی عمارت کا پارکنگ لاٹ اس وقت خالی تھی۔ جب دو لوگ تیز تیز قدم لیتے ہوئے وہاں آئے۔

”ایک منٹ پارکنگ لاٹ میں چڑیلیں کب سے ملنے لگیں؟“

مسکراتے ہوئے ہشاش ہشاش لہجے پہ وہ چونک کر مڑی۔ انگلیوں میں گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے وریام بیگ اسکے سامنے کھڑا تھا۔ شیزل نے گہری سانس لی۔ اسے دیکھ کر اچھا لگا تھا۔

”جب سے سرکٹوں نے پولیس تھانوں کا رخ کیا ہے تب سے ہم نے بھی کوہ کاف چھوڑ پارکنگ لاٹ آباد کئے ہیں۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈبہ اندر رکھا۔

”یوں اپنے آباد مسکن چھوڑ سرکٹوں کے پیچھے نکلنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”عشق محبت تو ہر گز نہیں۔“

وریام ہنس پڑا۔ شیزل اسکے ساتھ مسکرائی۔

”تم نے ٹھان رکھی ہے انسانوں کو خوش فہمیوں کے مواقع نہیں دوگی؟“

”جب یہ مواقع مجھے میسر نہیں رہے پھر کسی اور کو کیوں دوں۔“

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”کافی انتقامی مزاج خاتون ہیں آپ۔“

”آج تم کیوں آؤٹ آف کریکٹر جا رہے ہو؟“ اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ایک اور بات میری جان جو کھم میں ڈال کر تم نے براق کے خلاف اتنے ثبوت اکٹھا کروائے، پھر اسے expose کیوں نہیں کیا؟“

وریام اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ کھڑکی کا شیشہ کھول کر اسے دیکھا۔ ”لمبی بات ہے کسی دن مل کر کر سکتے ہیں؟“

تجسس کی ماری عورت کیا ہی کرتی۔ مان گئی۔ ”شیور، کسی اچھے کافی شاپ کی تلاش شروع کر دو۔“
وریام نے سر کو خم دیا۔ اور ہلکا سا مسکرایا۔ آج کئی ماہ بعد اسے اچانک دیکھ کر اچھا لگا تھا۔ جانے کیوں؟ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے او جھل ہو گئے تھے۔

اسکے چہرے اور آنکھوں کی سنجیدگی اس آدمی کو ہمارے لئے غیر قرار دینے پہ تلی ہوئی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے فائق نے ایک محتاط نگاہ اس پہ ڈالی۔

”تم شیور ہو مہدی؟ جس نے تمہیں اتنا عرصہ جہنم دکھائی ہے وہ اب تمہیں زندہ چھوڑے گا؟“
مہدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کتنے عرصے بعد یہاں آیا تھا؟ اسکی قید، پھر حکیم کے پاس اسکا قیام، اسکے بعد سکون کی تلاش میں سکر دو کا وہ چھوٹا سا گھر۔ اور آج وہ واپس اسی شہر آ گیا تھا۔ بادل، آسمان، ہوائیں سب وہی تھیں۔ مگر سب غیر تھا۔ کیونکہ یہاں ”وہ“ نہیں تھی۔ وہ کتنا مختلف انسان بن گیا تھا۔ زندگی کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

”مہدی وہ تمہیں مار دے گا“۔

”اس نے مجھے مار ہی دیا تھا۔“ موبائل پہ کھٹ کھٹ کرتے اس نے جواب دیا۔ ”یہ زندگی میں چھین کر لایا ہوں۔ اور چھینی ہوئی پہ جھپٹے مارنے والے خود بھی زخمی ہوتے ہیں۔“ بے تاثر لہجے میں جواب دیتے اس نے نگاہیں ایک بار پھر موبائل پہ جمادیں۔ اگر اسکے کندھے سے جھانک کر دیکھو تو وہ اپنے آفیشل ای میل

ایڈریس سے ایک ویڈیو مختلف ٹی وی چینلز کو فارورڈ کر رہا تھا۔ ویڈیو میں وہ لکڑی کی ایک کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اسکے عقب میں آرائشی قالینوں کے ٹکڑے لگے تھے۔ اگر ویڈیو پہلے کا بٹن دبا کر اسے آن کرو تو وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے مہدی سرور کبیر کہتے ہیں۔ میرا پیشہ، ذات، خاندان اس سے آدھی دنیا واقف ہے۔ اور سچ کہوں تو اس وقت مجھے اس سب میں دلچسپی نہیں ہے۔ میری واحد دلچسپی، فکر، ہر جذبہ صرف ایک انسان کے لئے ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ اسکی خالی آنکھوں میں لمحے بھر کو دنیا کا ہر جذبہ آیا تھا۔ اور اگلے لمحے وہ تاریک ہو گئیں۔

”میری بیوی زینیا حاکم نواب۔ میں اسے اون کرتا تھا، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔“ بھوری لکڑی کے اس کمرے نے اسے تکا اور تگے گئیں۔ ”میرا قتل جھوٹا تھا۔ جس نے بھی یہ سب کیا میں نہیں جانتا۔ میں ایک ماہ قید رہا اور اسکے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ ایک بار پھر مجھے اس وقت اس بارے میں بھی بات نہیں کرنی۔ اس دنیا میں اگر کوئی واحد شے قابل غور ہے تو میرے لئے وہ میری بیوی ہے۔ میرے ساتھ جو بھی حادثہ ہوا اس میں میری بیوی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ قابل احترام ہے، اور رہے گی۔ میری بیوی بے ریا ہے۔ معصوم اور وفادار۔ اس پہ لگنے والا ہر الزام جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ جس جس نے اسکے کردار اور اعمال پہ بات کی ہے میں ہر ایک کو عدالتی نوٹس بھجواؤں گا۔ میں آدھی دنیا پہ ہتک عزت کا دعویٰ کروں گا کیونکہ . . . میری . . . بیوی . . . قابل . . . احترام . . . ہے۔ اور کسی کو حق نہیں تھا وہ اس پہ بہتان لگائے۔“ اس نے ایک ایک لفظ توڑ توڑ کر ادا کیا۔

ایک گھر، ایک گاڑی اور چند کروڑ میں اس سے ”کہیں زیادہ اس پہ خرچ کر سکتا ہوں کیونکہ وہ اس قابل ہے۔ میری بیوی آنریبل ہے، اور اس نے مجھے واحد چیز جو دی ہے وہ ”سکون“ ہے۔ صرف سکون۔ سب

الزام ردی ہیں جن میں کہا گیا کہ وہ مجھے ذہنی اذیت دیتی تھی۔ وہ مجھ سے رقم بٹورتی تھی۔ میرے پاس کسی ارادے سے آئی تھی سب جھوٹ۔ وہ میرے پاس نیک بخت سے آئی تھی۔ اسے میرے اللہ نے میرے لئے بطور انعام بھیجا تھا۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ پھر کہنا شروع کیا۔

میں اب اسکی تلاش کروں گا۔ لیکن میں ان لوگوں ”کوہر گز نہیں چھوڑوں گا جنہوں نے میری بیوی پہ بات کی ہے ان سب سے حساب ہو گا کیونکہ اب بہت ہو گیا کہ آپ کسی کے گھر کی عورت پہ بات کریں اور آزاد ہو جائیں۔ اب بس۔“ اس نے لمبی گہری سانس لی۔ ”زینیا حاکم.... اگر تم مجھے سن رہی ہو تو یاد رکھنا میں تمہارے لئے آؤں گا۔ میں نے کہا تھا میں تمہارے لئے reserved رہوں گا۔ میں ہوں۔ میں نے کہا تھا میں تم سے کبھی موو آن نہیں کر سکوں گا میں نے نہیں کرنا۔ تم جہاں بھی ہو میں تمہارے لئے بہت جلد آؤں گا۔“

مجھے فکر رہے گی تمہاری۔“

کبیر محل دروازے کے باہر گاڑی روکتے ہوئے فائق نے دگر فستگی سے کہا۔ وہ ان سات ماہ کو نہیں بھولا تھا جس میں اسکا دوست ایک ابنار مل انسان رہا تھا۔ وہ راتوں کو سو نہیں پاتا تھا اسکے زخم اسے رونے پہ مجبور کرتے تھے، دنیا سفید ہوتی جاتی تھی اور چیختے چلاتے ہوئے اٹھ بیٹھتا تھا۔ یہ وہ زندگی نہیں تھی جو اسکے دوست نے گزاری تھی۔ اس روز مری کی اس سڑک سے اسے گھر، پھر اسکر دولے جاتے ہوئے وہ صرف ایک امید لے کر گیا تھا۔ ”زندگی ”مل تو گئی تھی مگر اسکی مدت کیا تھی یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”میری فکر مت کرو تم۔“

مہدی نے اسکے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”مرے ہوئے کو کوئی نہیں مارتا۔“ کہہ کر چند پل فائق کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ اونچا سفید اور سیاہ محل اپنی تمام تر شان کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ آج بھی بالکل ویسا تھا جیسا مہدی اسے چھوڑ کر گیا تھا یا بھیجا گیا تھا۔

اسی لمحے محل کے دروازے کے پٹ واہوئے۔ دروازے کے اس پار قیس کبیر کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اب کوئی دروازہ نہیں تھا۔ کوئی باڑ نہیں، مگر ان دونوں کے درمیان بہت کچھ تھا جو تاقیامت رہنے والا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تھم گئے تھے۔ وقت تھم گیا۔ ہر آہٹ، ہر شے تھم گئی۔ بس وہ دونوں تھے جو ایک دوسرے کے روبرو تھے۔

سیاہ آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اسکی آمد کی توقع رکھے ہوئے تھیں۔ سبز آنکھیں بے تاثر تھیں۔ شاید اپنا ہر جذبہ کھو چکی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان واقعی بہت کچھ تھا۔ آٹھ ماہ ہر شے بدل گئے تھے۔

مہدی آگے بڑھا۔ چند قدم، مزید چند قدم اور پھر وہ اسکے عین سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ کئی ساعتیں چپ کی نذر ہوئیں۔ پھر قیس آگے بڑھا دھیرے سے اسے گلے سے لگایا۔ نرمی سے اسکا کندھا چوما، پیٹھ پہ تھکی دی۔

”ویلم ہوم۔“

ایک جذب سے کہا۔ کبیر محل کے در و دیوار حیرت سے اس منظر کو تک رہے تھے۔ ”میں تمہارے بغیر اکیلا ہو گیا تھا۔“ مہدی نے آج اسکے کندھوں کے گرد بازو نہیں باندھے۔ آج اسکے دل میں ٹھنڈک نہیں

اتری۔ آج وہ انسان اسکے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اسکے سینے پہ رکھتے مہدی نے اسے الگ کیا۔ قیس کی نگاہوں میں نرمی برقرار رہی۔ سبز آنکھوں میں لا تعلق بھی برقرار رہی۔

”تم نے واپس آنے میں بہت وقت لے لیا مہدی۔ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔“ وہ بہت دیر بعد مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

مہدی تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑا۔ ”میرا انتظار؟ تم نے میرے جھوٹے قتل پہ کھیل کھیلے اب میری زندگی پہ کوئی سازش رچانی ہوگی رائٹ؟“

قیس نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کتنا منفی سوچنے لگے ہو۔ تم نے میرے ساتھ کیا نہیں کیا وہ سب بھول کر اب تمہیں قبول کر رہا ہوں؟ میں نے“

“ spill it qais. ” وہ ہتھرتھا سو وہی رہا۔ ”کیا چاہیے مجھ سے؟“

”تم آرام کرو، وقت لو۔ ہم پھر بات کریں گے۔“ قیس نے بہ دقت خود کو نارمل رکھا اور اسکا شانہ تھپکا۔ مہدی پیچھے ہوا قیس کا بازو ڈھلک کر گر گیا۔ ”تمہاری صحت، تمہارے ذہن کو فحالی سکون کی ضرورت ہے۔ ہم پھر بات کریں گے۔“

وہ آٹھ ماہ بعد آیا تھا اور کوئی حال احوال نہیں ہوا۔ کوئی جذباتی جملوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت فاصلے پہ آگئے تھے۔ قیس کو فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ ”اسے“ واپس لے آئے۔ پھر اس آدمی کو قبر میں اپنے ہاتھوں سے اتارے گا۔

مہدی نے ایک اچھتی نگاہ اس پہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ ہال، زینے، راہداریاں، سب سنسان پڑا تھا سب خالی۔ وہ اندازہ کر چکا تھا یہاں کیا ہوا ہو گا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے الماری کے دراز کھولے کچھ سامان

الٹ پلٹ کئے۔ ویزا، پاسپورٹ اور دیگر کاغذات اٹھا کر بیڈ پہ رکھے۔ پھر ایک بیگ نکالا۔ الماری سے بغیر دیکھے کچھ کپڑے نکال کر بیگ میں ٹھونسے، کاغذات اندر رکھے۔ اس پہ کسی ناسٹیلیجیا کا اثر نہیں ہوا۔ اس کمرے میں واپس آکر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ اس گھر اور مکینوں کے لئے اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ اور اگر ایسا کچھ ہوا بھی تھا تو اس نے ظاہر نہیں کیا۔

وہ چند منٹ کے اندر واپس نیچے آیا تو قیس ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ مہدی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے علم ہوا کہ جس بھائی کو وہ کھو چکا تھا واپسی پہ وہ واپس نہیں آیا تھا۔ یہ واپسی کسی اور انسان کی تھی۔ اسکے کندھے پہ بستہ تھا اور وہ چند منٹوں کے اندر اندر باہر جا رہا تھا۔ جب قیس کمبیر اسکے سامنے آکر رکا۔

”تم ابھی آئے تھے ہمیں بات کرنی تھی تم... تمہیں اعلان کرنا ہو گا کہ تم واپس آچکے ہو۔ تم یہ سب بتاؤ گے تو وہ منظر عام پہ آجائے گی۔ تم ایسے نہیں جاسکتے۔“ اس نے کہہ دیا۔ اسکا چہرہ ایک ایسے انسان کا چہرہ تھا جسے صرف خود سے فرق پڑتا تھا۔

”فکر مت کرو، میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ اپنی بیوی کے ساتھ۔“ قیس تھم گیا۔ ”مجھے واپس آنے دو، میں سارے حساب برابر کروں گا۔“

وہ اسکے دائیں طرف سے گزر کر آگے چلا گیا۔ اسکے کندھے پہ سفری بستہ تھا۔ اور چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی۔ اسکی جیب میں پڑا موبائل تھر تھرا رہا تھا۔ وہ واپس آگیا تھا مہدی کمبیر نہیں مرا تھا یہ ایک خبر ہی اس کے سننے اور جاننے والوں کو دیوانہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ مگر وہ جس کے حصول میں دیوانہ ہو رہا تھا اسکی تلاش اسے نہ جانے کہاں لے کر جانے والی تھی۔ اسکے عقب میں کھڑا قیس کمبیر آج بھی تہی داماں تھا۔

وہ یہاں کیوں آیا تھا؟

اسکا جواب بے حد واضح تھا۔ زرد رنگ کی اس عالی شان حویلی سے اسکے کئی تعلق تھے۔ یہاں آنے کے لئے، اس بادشاہت کے لئے اس نے کئی دریا پار کئے تھے۔ اپنے باپ کی محبت میں اس نے دل مارا تھا خود کو گرایا تھا۔ مگر اسی باپ کی نفرت میں اسے صرف ایک کام کرنا تھا۔ یہاں اس حویلی میں واپسی۔ قیس کمبیر کے لئے اس نے کئی قربانیاں دی تھیں اور اب اس سے انتقام کا سہ آگیا تھا۔

سفید شلوار قمیض کے ساتھ سیاہ شال پہنے پیروں میں روایتی بلوچی جوتے پہنے اس نے بال سلیقے سے جما رکھے تھے۔ رنگ کے علاوہ اسکے نقوش کافی حد تک عالم نواب سے ملتے تھے۔ وہ کئی ملازمین کی معیت میں چلتا ہوا حویلی کی روش پہ اپنے مضبوط قدم دھر رہا تھا۔

آج ہر محرومی ختم۔

یہ جنگ، یہ پہچان، نفرت کے نام۔

آج سے نیا سفر شروع۔

آج سے وہ قیس کمبیر کو گرانے کے لئے علاقائی داؤ پیچ کھیلے گا۔

عالم ارواح میں آج اسکے باپ کو علم ہو گا وہ کتنا غلط تھا۔

اسکی مقتول ماں کا انصاف ہو گا۔

تسکین ملے گی یا نہیں مگر انتقام پورا ہو گا۔

اسے جس کمرے میں لایا جگہ وہ جرگہ گاہ تھی۔ پر تعیش اور شاہانہ۔ اسے وہیں بٹھایا گیا جہاں نواب خاندان کے باقی مرد بیٹھے تھے۔ ایک کرسی پہ دستار رکھی تھی۔ براق گردن فخر سے سیدھی کئے بیٹھا تھا اسکی دائیں طرف بشر حاکم اور ضیغم میر بیٹھے تھے۔ یہ محفل آج اسی کے لئے تھی۔

محفل میں باتیں ہوئیں، احوال ہوئے، تعارف ہوئے، سلامتی بھیجی گئی۔ اور اسکے بعد عالم نواب کی مدبر آواز گونجی۔

”یہ علاقہ، یہ دستار اور زمینیں ان پہ پہلا حق حاتم کا تھا۔ میری پہلی اولاد۔“ محفل میں لمحے بھر کی خاموشی چھا گئی۔ براق کے دل پہ قیامت گزر گئی۔ ”ہماری بلائیں اس نے اپنے سر پہ لے لیں۔ میری دستار پہ دوسرا حق میرے وارث کا ہے۔ جس سے میری محبت کا کوئی پیمانہ نہیں۔ ہم نے ایک لمبی جدائی دیکھی ہے اور سچ کہوں تو جتنے سال اسکے بغیر گزرے بے کار گزرے۔ لیکن اب اسکی واپسی ہوئی ہے ہمارے لئے اسکی واپسی ایسی ہے جیسے قیامت کے بعد امت کو بخشش کا اعلان۔“

لوگ غور سے سن رہے تھے۔ ایک ایک حرف سچ تھا۔ ایک ایک حرف میں صداقت۔ عالم اپنی جگہ سے اٹھے انکے ساتھ انکے دو بیٹے بھی اٹھے۔ اب وہ دستار اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے آئے۔ براق مسکرایا۔ آنکھوں میں عجیب چمک در آئی۔

”میری دستار میرے پوتے بشر حاکم نواب کے نام۔“

کوئی جو تا تھا جو براق حنیف کے منہ پہ مار دیا گیا تھا کوئی حق تھا جو چھینا گیا تھا کوئی بر چھی تھی جو دل میں گھسا کر وہیں چھوڑ دی گئی تھی۔ تاریخ میں پہلی بار ایک فرعون کو دوسرے فرعون سے مات ہوئی تھی۔

پیادہ ہر کھیل ترتیب کر کے، حرچال چل کر لٹ اور لٹا کر آخر میں پیادہ ہی رہا۔ بادشاہت اسکے لئے نہیں تھی۔ کوئی اسے بتائے۔

جاری ہے۔۔۔

(باقی آئندہ قسط میں)

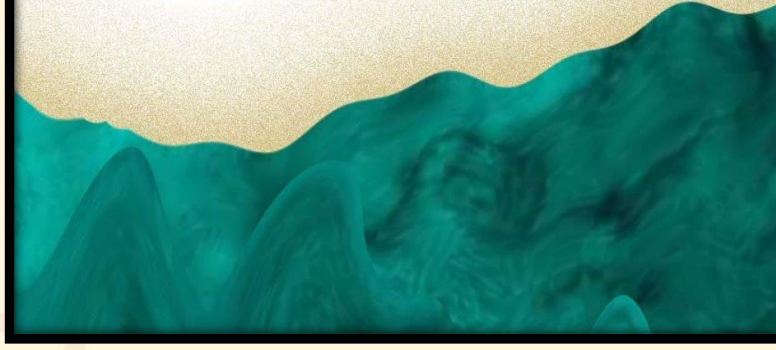


[Click here](#)

safareadab.com

پل صراط

عنیزہ زاہد



"تم مجھے ایک برا انسان سمجھتی ہونا۔ مجھے پہچاننے میں تم سے ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میں صرف برا نہیں، ایک بدترین انسان ہوں۔" وہ گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔ شراب گلاس سے باہر گرنے لگی تھی پر اسے تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے وہ گلاس اٹھایا اور اسکی طرف دیکھا۔

وہ خوف سے اپنی جگہ پر سمٹی۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ اس وقت تمہارا کوئی موڈ نہیں ہے مجھ جیسے شرابی کے منہ لگنے کا؟" وہ خود سے سوال کرتا، خود سے جواب دیتا اس کے قریب بیٹھا۔ "اور یہ کہ میں نشئی ہوں؟ آج تمہیں بھی شراب کی لذت چکھاؤں گا۔" اس نے گلاس منال کے منہ کے قریب کیا۔

☆☆☆

'کبھی تو تو بھی محبت کرے گا۔'

فاران احمد نے محبت کی تھی!

'تو بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہے گا۔'

اس نے بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور پھر۔۔ پھر وہ تجھے چھوڑ جائے گی۔'

اور پھر وہ اسے توڑ گئی۔

'پھر میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور کہوں گا کہ دل پہ مت لے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا، کوئی اور آجائے گی۔' اس کے جانے کے بعد کوئی نہیں آیا۔ اس نے آنے ہی نہ دیا۔

[Click here](#)

safareadab.com

ایسین خان



ابراہیم

"یہاں دستخط کرو غازہ ! " کاغذ غازہ کے سامنے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو غازہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے اس اجنبی شخص کو دیکھا جس سے ابھی وہ چند گھنٹوں پہلے ملی تھی۔ ان چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس شخص کو اس کا حقارت بنا ڈالا تھا۔ زندگی میں پہلی بار قلم پکڑتے ہوئے غازہ کے ہاتھ بڑی طرح کانپنے لگے۔ وہ تو با آسانی قلم تھام کر شفاف کاغذ پر آدھی تر چھی لکیریں کھینچ کر بہت سارے خاکے بنا لیا کرتی تھی، کچھ دھندلے ہوتے تو کچھ میں پہلی ہی حسرت میں جان موجود ہوتی۔

"تم رشتے کھونے سے ڈرتی ہو غازہ ! " سیکم کا چند روز قبل کہا گیا جملہ کان کے پردے پر ابھرا تھا۔ "بچ کہا تھا تم نے میں رشتے کھونے سے ڈرتی ہوں سیکم ! اور یہ نیا دھور رشتہ بھی شاید میں کھونے کے لیے ہی بنا رہی ہوں۔" دل میں اس کے کہنے کا جواب دے کر اس نے کاغذ پر قلم گھسیٹا تھا۔ عجیب بات تھی وہ ایک کاروباری شادی کے لیے دلہن بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری زندگی برباد کر کے تم یہاں سکون سے سو رہی ہو۔ شام سے مینو مجھے فون کر رہی ہے اور میں اس کا فون نہیں اٹھا رہا جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں اس سے بے وفائی کرنے پر بے حد شرمندہ ہوں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو چاہا ہے اور تم زبردستی ایک بزنس ڈیل کی طرح میرے سر پر آ گئی ہو۔" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا اپنے اندر کا سارا انتشار اس پر انڈیل رہا تھا۔ غازہ خاموشی سے بس اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے واقعی ہی اس شخص پر ترس آیا تھا جس کی محبت آباد ہونے سے پہلے ہی اس کے باپ نے اجاڑ دی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"میں بہت تلخ ہو چکی ہوں کلج ! جانتے ہو کیوں؟" اس نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انتہائی آہستگی سے کہا تھا۔

"کیونکہ اس دنیا اور معاشرے کی سفاکی آپ کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اول تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے کمینڈ ہو اور بالفرض اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو تب بھی میں وہاں کچھ نہیں کر پاتی۔ میں یہ کاغذی تعلق تب بھی نہیں روک سکتی تھی۔ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں کلج ارسلان ! بلکہ اپنے مجرم تم خود ہو۔ مینو کے مجرم تم ہو جو محض اپنے باپ کی لالچ کے ہاتھوں اپنی محبت پر ایک کاغذی سوتن لے آیا۔" وہ سینے پر بازو پیٹتے انتہائی تلخی سے کہہ رہی تھی جبکہ کلج بس حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو میرے لیے اب محبت کیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو بمشکل روکے ہوئے تھی۔ "م جس سے (ال) مالک شروع ہوتا ہے، ح جس سے (ال) حلیم شروع ہوتا ہے، ب جس سے (ال) باری اور ت سے تمنا (وہ جو اللہ سے کی جاتی ہے) شروع ہوتی ہے۔ بس یہی ہے میرے نزدیک محبت!" وہ ضبط کی انتہا پہ تھی۔ "ایک وقت تھا تم میری تمنا تھے مگر اب صرف ایک ہی تمنا ہے میری۔۔۔ اللہ۔۔۔ بس اللہ۔۔۔!" وہ رکی اور گہرا سانس لے کر بولی۔ "ایک بار بھائی نے کہا تھا کہ ایک بار جو چڑھ جائے رنگ حب الہی تو اترتا نہیں۔۔۔! ہاں وہی رنگ چڑھ گیا ہے مجھے۔" وہ زید کی خاموشی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اب ایک آخری جملہ رہ گیا تھا کہنے کو۔ وہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی کہ زید بولا۔ "تمنا تمہیں نہیں بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا تھا، اور تمہارا ہی رہوں گا۔ شوہر کی تمنا بھی ہوتی ہے بھلا کسی کو۔" وہ مسکراتے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوہر کے غیر محرم ہونے میں بس ایک دستخط کی دیر ہوتی ہے۔" وہ سنگدل ہو چکی تھی۔ دوسری جانب زید کو دھچکا لگا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سننے میں آیا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" اسے جھکا لگا کیا وہ جان گئے تھے۔ وہ ذرا بوکھلا گئی مگر جھوٹ وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"جی، مگر آپ سے کس نے کہا؟" اس نے لکھ ہی دیا۔

"وہ اہم نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" وہ کچھ مزید بوکھلائی۔ اب کیا کرے؟

"میں نہیں بتا رہی۔ ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ میں ایسے تو نام نہیں بتا سکتی نا؟" اسے یہی جواب ٹھیک لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ یہ تاثر دے گی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس نے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ اب جھوٹ ہے تو جھوٹ سہی۔ شرم سے توجہ ہٹا کر گئی۔

"ویسے تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔" وہ گھبراہٹ میں پگھل رہی تھی جلتی موم کی طرح۔

اچھا اتنے پریقین ہیں تو بتائیں نام؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ناپ کیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ہی پسند کرتی ہو، آخر۔۔۔" وہ دم بخود رہ گئی۔ آخر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ در اگر وہ جانتے تھے تو کب سے جانتے تھے؟ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

Click here
safareadab.com



دنوشہ آرزو

s a f a r e a d a b . c o m

Click here

safareadab.com

وراثت

فاطمہ ملک

"اگر تمہاری مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں موقع ملتا تو کیا تم حسن خان کو اپنا بیٹا؟"

رقیہ الجھ سی گئی۔ "میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔"

وارث جان نے بہت سوچنے کے بعد سوال کا انداز بدل دیا۔ "تمہیں مجھ میں یا حسن خان میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو کسے چنو گی؟"

رقیہ وارث کے اس سوال پر ناراض ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ یہ کیسا عجیب سا سوال ہے۔ آپ شوہر ہیں میرے اور وہ کوئی نہیں میرا۔ بس ساتھ پڑھتا ہے اور اچھا کلاس فیلو ہے۔ اس کا آپ سے کیا مقابلہ بھلا!!"

وارث جان ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ "رقیہ میں صرف اور صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حسن خان کے ساتھ کو پا کر خوش رہ سکتی ہو تو۔۔۔" اس کے باقی ماندہ الفاظ اندر کہیں دب کر رہ گئے تھے۔ رقیہ جو وارث جان سے کبھی اونچی آواز میں بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وارث جان کے گال پر زور دار تھپڑ مار دیا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیسے اس کا ہاتھ وارث پر اٹھ گیا۔

☆☆☆

"امبر تم نے کہیں رقیہ کو دیکھا ہے۔ مجھے گیٹ سے پتا چلا کہ رقیہ آچکی ہے۔" رقیہ کی حسن کی طرف بیک تھی۔ رقیہ مسکراتے ہوئے ہلٹی اور حسن خان وہیں دل تمام کر کھڑا ہو گیا۔ "اف۔۔۔ کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔" اس سے پہلے کہ حسن خان مزید کچھ اور کہتا رقیہ اس کی طرف بڑھی۔ حسن خان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ آج وہ رقیہ کو پا لینے کے جنون سے آیا ہے۔ حسن خان کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہوں نے رقیہ کے لیے تعریفی جملے کہے اس طرح کہ۔ "بہت خوبصورت ہو تم اور آج تو بہت زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ جانتی ہو آج مجھے کیوں لایا ہے اپنے ساتھ؟؟" ابھی وہ مزید کچھ کہتیں کہ رقیہ نے مسکرا کر حسن کو مخاطب کیا۔

"حسن ان سے ملو میرے سہنڈ۔ سردار وارث جان۔" حسن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں وہ بے اختیار بولا "کیا؟؟؟ کیا کہا ہے تم نے۔۔۔؟؟؟ کون ہے یہ؟؟۔۔۔ مطلب تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے ان کا؟؟؟"

نادوں میراجرم کیلے کی دیکھ جھلک

"وہ بھاگتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا سامنے سٹرچ پر
مشینوں سے جکڑا بے جان وجود پڑا تھا کمرے میں لال
رنگ کی ہلکی سی بتی جل رہی تھی خاموشی میں مشین کی
بب بب آواز گونج رہی تھی بو جھل قدموں کے ساتھ
وہ چلتا ہوا اد کے پاس آ گیا۔

"ناراض ہو مجھے سزا دے رہی ہو۔ اچھا اب اپنے شوہر
کو معاف کر دو پلیز۔"

زخمی دل کے ساتھ وہ اس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط
ہاتھ میں تھام کر سٹول پر بیٹھا۔
"پتہ ہے پری تم اتنی حسین ہو کہ میں جب تمہیں
دیکھتا

ہوں پوری دینا بھول جاتا ہوں۔ بس ایک بار صرف
ایک بار آنکھیں کھولو تم مجھے جو چاہے سزا دے دینا
بس ہوں خاموش نہ رہو پلیز۔"
اس کی آنکھوں میں التجا تھی آنکھیں ایک بار پھر سرخ
ہو رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو کس نے اندر آنے دیا تمہیں
۔" شادی ایک دم اندر آیا اور اسل پر برس پڑا۔
"نگو یہاں سے فوراً۔"

Safar-e-Adab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

www.safareadab.com

میراجرم کیا ہے

ماہ نومبر خان

شناویز چلایا۔

"شناویز یہ کیا کر رہے ہو پری کے پاس اتنا شور ٹھیک نہیں۔"

"پہلے اسے اس حال میں لے کر آئے اور اب یہ دکھاوا۔"

مکمل ناول فری میں پڑھنے کے لیے یہاں
کلک کریں۔

safareadab.com

BEING THE STRING OF YOUR KITE

سفر ادب کی جانب سے ناولوں کی پی ڈی ایف کاپی کو ہر غلطی سے ماورا بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کسی بھی طرح کی غلطی پائی جانے پر اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔ ہماری ٹیم کے تیار شدہ پی ڈی ایف کے تمام جملہ حقوق سفر ادب کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ کسی ادارے یا شخص کی جانب سے ہمارے کام کو اپنے آفیشل استعمال میں لانے کی کوشش کو غیر قانونی سمجھ کر سفر ادب کی جانب سے کارروائی کی جاسکتی ہے۔

- ٹیم سفر ادب